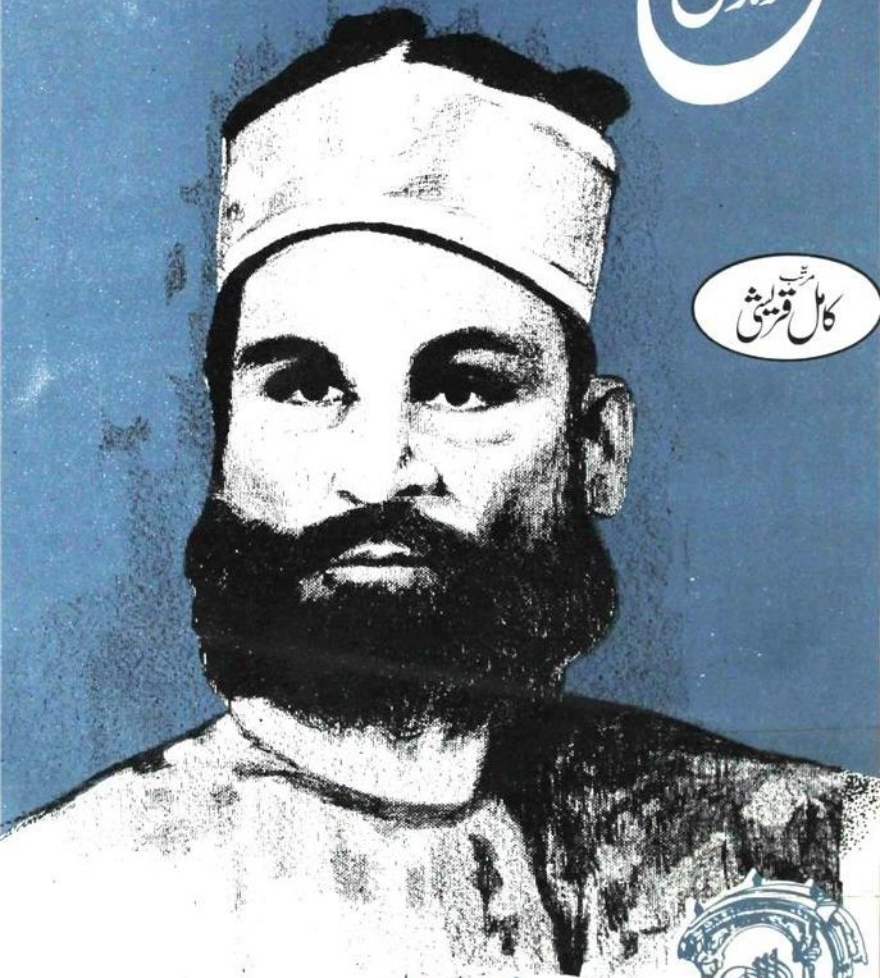


حیات اور کارنامے

داغ
دہلوی

کامل قریشی



اردو اکادمی - دہلی



دَآغِ دہلوی

(حیات اور کارنامے)

سرفراز کیے گئے اور زندگی کے آخری لمحے تک داد و دہش کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۱۷ء میں اُن کا انتقال حیدر آباد میں ہوا اور وہیں درگاہ شاہ یوسفین میں آسودۂ خاک ہوئے۔

داغ کی خوش قسمتی تھی کہ اُنھوں نے اپنے انتقال کے بعد اپنے شاگردوں کی ایک کثیر تعداد میں جماعت چھوڑی جو ایک شمار کے مطابق تقریباً پانچ ہزار سے بھی زیادہ تھی۔ ان میں عالم، فاضل، لائق، فائق اور غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے ہر مذہب و ملت کے اشخاص اور ملک کے گوشے گوشے کے افراد شامل ہیں۔ جن کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ ان شاگردوں کے باقاعدہ رجسٹر تھے جن میں ان کی تفصیلات رہتی تھیں مقامی شاگردوں کے علاوہ دور و دراز جگہوں کے تلامذہ کا نام بھی اصلاح کے لیے آتا تھا اور داغ اصلاحیں دے کر واپس بھیجتے تھے، شاعری کے فن، شعر کی نوک پلک اور شعر و شاعری سے متعلق جملہ امور کی انجام دہی میں داغ کا مکتب فیضان شب و روز مصروف رہتا تھا۔ اس طرح فکر و فن، شعر و ادب اور شاگردوں کی علم پروری اور تربیت شعر کا کام جاری رہتا، دیستان تربیت کے طور پر یوں تو داغ سے قبل کے اساتذہ نے بھی اپنے تلامذہ کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑی ہوگی لیکن جس طرح داغ نے بذاتِ خود ایک دیستان بن کر اپنے وابستگان کی خدمت انجام دی اور پھر داغ کے شاگردوں نے جس طرح چراغ سے چراغ جلائے اور فیضانِ داغ سے دنیائے علم و ادب منور ہوئی۔ یہ واقعہ ہماری تاریخ ادب کا ایک روشن باب ہے ہماری شاعری اور زبان پر داغ کے عظیم احسانات ہیں۔ ۱۹ویں صدی عیسوی کے زمانے میں داغ نے شاعری کو جو نئے رخ، تروتازگی، شگفتگی اور زندگی عطا کی وہ داغ ہی کا حصہ ہے اگر داغ نہ ہوتے تو زبان جس گل و گلزار، باغ و بہار اور جاندار و شاندار انداز میں ہم تک پہنچی ہے اس سے شاید ہم محروم رہتے، داغ کے فکر و فن اور زبان و ادب کی اس گر افقد خدمت کے لیے جب کبھی اُن کا ذکر یا نام آئے گا اردو دنیا کا سر احترام سے جھک جائے گا۔

داغ کی شعری، فنی، علمی، ادبی اور لسانی خدمات کا اعتراف کرنے اور خراج عقیدت کی صورت میں اُن کی یاد تازہ کرنے کے لیے ایک عرصے سے یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ اُن

چلبست کے قول کے مطابق جو درست معلوم ہوتا ہے یہاں دوسرے مصرعے سے دآغ کی مراد یہ ہے کہ جیتی مکھی دیکھ کر نہیں نگھی جاتی۔ ہیرے کی کنی سے آنسو کی تشبیہ یقیناً لاجواب ہے لیکن ہیرے کی کنی تو خود کشی کرتے کے لیے جان کر ہی کھائی جاتی ہے۔ دآغ کا دوسرا شعر چلبست نے یہ پیش کیا ہے

کیا قبر ناتواں کی ترے بے نمود ہے

افسوس فاتحہ ہے نہ جس کی درود ہے

چلبست کا یہ خیال صحیح ہے کہ دآغ نے مرگے مردود فاتحہ نہ درود محاورے کو نظم کیا ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ یہ محاورہ افسوس کرنے کے لیے نہیں بلکہ لعنت بھیجنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چلبست نے دآغ کے بعض محاوروں پر اعتراض کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ ان محاوروں کا نظم کرنا ریختہ متین کی شان کے خلاف ہے۔ لیکن یہاں ریختہ کے ساتھ متین کی شرط شاید زیادتی کی بات ہے اس لیے کہ ہر شاعر کا ریختہ اس کے اپنے رنگ میں ہوتا ہے اور شاعر کی اقتاد طبع کے اعتبار سے اس میں پھکڑا پن شگفتگی یا متانت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ریختہ متین کی شان کے خلاف دآغ کے جن اشعار کی مثال چلبست نے پیش کی ہے ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جن کی برجستگی پر کون کا فر ایمان نہیں لائے گا۔ ذرا ملاحظہ ہو دآغ کے ان دو شعروں میں دہلی کے روزمرہ کا ٹھٹ سے

اے شیخ جو بتائے مے عشق کو حرام

ایسے کے دو لگائے بھگو کر شراب میں

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک

مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں ملے

دآغ جب رام پور پہنچے تو وہاں ان کی دھوم مچ گئی اور اس مقبولیت کے

سبب رام پور میں ان کے حریف بھی پیدا ہو گئے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ داغ کارنگ سیاہ تھا اور یہ بھی کہ رام پور میں انھیں اصطلیل اور دوسرے محکموں کے داروغہ کی نوکری ملی تھی۔ چنانچہ رام پور کا ایک واقعہ خود داغ نے ہنس ہنس کر سنایا اور وہ یہ تھا کہ ایک روز اصطلیل کے دروازے پر یہ شعر چسپاں تھا

شہرِ دہلی سے آیا اک مُشکی

آتے ہی اصطلیل میں داغ ہوا

داغ کا کہنا تھا کہ اگرچہ شعر میری ہجو میں تھا لیکن اس شعر میں جن لفظی رعایتوں سے کام لیا گیا تھا اسے دیکھ کر بے اختیار داد دینے کو جی چاہا۔ داغ نے ایک جگہ خود یہ بیان کیا ہے کہ ایک مشاعرے میں میں نے اپنا مطلع پڑھا اور جلال سے داد کا طالب ہوا۔ مطلع تھا

یہ تری چشمِ فسوں گر میں کمال اچھا ہے

ایک کا حال برا ایک کا حال اچھا ہے

جلال نے مسکرا کر کہا پہلا مصرع نہیں لگا چنانچہ داغ کہتے ہیں کہ جب جلال کے پڑھنے کی ہاری آئی تو آنکھوں نے میرے مصرعِ ادنیٰ کو بدل کر ملاحظہ ہو داغ نے جلال کے بہتر مصرعے کے مقابلے میں اپنے مصرعِ اولیٰ کو مصرعِ ادنیٰ کہا ہے (یوں شعر بنایا ہے

دل مرا آنکھ تری دونوں ہیں بیمار مگر

ایک کا حال برا ایک کا حال اچھا ہے سہ

سخنِ فہمی میں شاید یہ بات بھی شامل ہے کہ غزل میں شعروں کی بھرمار اس طرح نہ کی جائے کہ گنے چنے قوانی بار بار نظم ہوتے رہیں ایک ہی قافیہ کا ایک سے زیادہ اشعار میں نظم ہونا اس بات کی دیں تو ہو سکتا ہے کہ شاعر نے ایک لفظ کو کتنے معنی

پہنائے لیکن حد سے گزر جانے کے بعد یہ چیز بھرتی میں شامل ہو جاتی ہے کسی شاعر کا مصرع طرح تھا سہ یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے۔ بڑی، لڑی، کڑی قافیہ تھا۔ نظام حیدر آباد نے اس طرح میں ایک سو بارہ شعر کی چار غزلیں کہیں اور داغ نے صرف بیالیس شعر، سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا داغ بھی اتنے ہی شعر نہیں کہہ سکتے تھے یقیناً کہہ سکتے تھے لیکن پھر وہ شاید بھرتی کے اور بے مزہ شعر ہوتے۔ اس زمین کے امکانات پر غور کیجئے تو مفرد الفاظ میں یہ پندرہ قافیہ ہاتھ آتے ہیں اڑی، بڑی، پڑی، پھڑی، تڑی، ٹھڑی، جڑی، بھڑی، چھڑی، سڑی، کڑی، اکھڑی، گڑی، گھڑی اور لڑی۔ ان لفظوں سے مرکب الفاظ بنا کر جن میں یقیناً قافیہ کی ندرت برقرار نہیں رہے گی قافیوں کی تعداد کو دو گنا یا زیادہ سے زیادہ تین گنا کیا جاسکتا ہے جس کا مطلب ہے لگ بھگ پینتالیس قافیہ۔ ایسی حالت میں فصاحت کا تقاضا شاید یہی تھا کہ بہت سے بہت بیالیس شعر پر اکتفا کیا جاتا۔

شیخ امداد علی بھرتی نے داغ کو اپنی ایک غزل، محبی اور ان سے کلام کی داد چاہی۔ غزل کی ردیف تھی 'چھاتیان' اور قافیہ تھا پتھر، ستم گر، پیکر وغیرہ۔ داغ نے اس کا جواب یہ دیا کہ مجھ سے زیادہ ابھی تعریف اس غزل کی آپ کی مائیں کریں گی۔ شتر گربہ کے بارے میں داغ کا خیال یہ تھا کہ تم کے ساتھ آپ کا استعمال تو یقیناً شتر گربہ ہے لیکن تم کے ساتھ حضرت کا استعمال جائز ہے اور یہ شتر گربہ نہیں۔ اس سلسلے میں داغ کے ایک شاگرد کا یہ شعر ملاحظہ ہو جس کے بارے میں داغ نے شاگرد کو یہ سند دی تھی کہ اس میں شتر گربہ نہیں ہے سہ

تم جو بے ہوش ہوئے طور پہ کیا دیکھا تھا
بات کہتے تو بھلا حضرت موصیٰ کوئی تھ

معاب شاعری میں جس چیز کو پہلوئے ذم کہا جاتا ہے داغ اس کا لحاظ رکھتے

تھے کہ شعر میں ایسی کوئی صورت نہ پیدا ہو۔ فصیح اللغات کے لیے احسن مارہروی کو بُرا
لگنے پر انھوں نے یہ شعر لکھوایا ہے

معشوق سے شکایت جو روحِ جفا ہے جرم
اس کو بری لگے تو خدا کو بری لگے

شعر مکمل کرتے ہی ذہنِ دجور، کی جانب منتقل ہوا جو ایک نظر میں جو رو بھی پڑھا
جاسکتا تھا چنانچہ پہلا مصرع فوراً بدل کر اس طرح کر دیا ہے 'معشوق سے شکایت'
بیداد جرم ہے کسی مشاعرے میں جلائی کے ایک شاگرد کاوش نے یہ مصرع پڑھا ہے
خود کنوئیں میں گر پڑے جو روئے دلیر دیکھو

مصرع سن کر داغ نے کہا میاں کاوش استاد کو دکھا کر غزل پڑھا کرو اور برجستہ مصرع
سے 'جو رو' کو نکال کر اس طرح درست کیا ہے
جو کنوئیں میں گر پڑے خود روئے دلیر دیکھ کر لہ

فصیح اللغات؛

داغ کو نظام حیدر آباد کی جانب سے فصیح الملک کا خطاب ملا تھا۔ اسی
فصیح الملک کی رعایت سے مولانا احسن مارہروی نے اپنے قیام حیدر آباد کے دوران
فصیح اللغات کے نام سے ایک لغت کی تالیف کا کام شروع کیا تھا۔ وہ اس لغت کو
زبانِ دہلی کی لغت کے طور پر مرتب کرنا چاہتے تھے جس میں محاوروں اور الفاظ کی
سند صرف داغ کے کلام سے لائی جاتی تھی۔ اگر کسی لفظ یا محاورے پر داغ کا شعر
پہلے سے موجود نہیں ہوتا تھا تو داغ سے شعر کہلوا لیا جاتا تھا۔ خود داغ اس لغت
کی تالیف میں بے پناہ دلچسپی لیتے لگے تھے لیکن افسوس اس لغت کے صرف دو جز ہی
مکمل ہو سکے اس کے بعد احسن حیدر آباد سے چلے آئے اور باوجود کوشش کے یہ کام

مکمل نہ ہو سکا۔ لہٰذا یہاں مثال کے طور پر صرف ایک شعر پیش ہے جو 'پی کر رہ جانا' پر
 داغ نے احسن کو کہہ کر دیا 'پی کر رہ جانا'، غصّہ ضبط کرنے کے معنوں میں آتا ہے۔
 شعر یہ تھا

اس نے غیروں کو پلائی بزم میں
 رشک سے ہم غصّہ پی کر رہ گئے

مولانا ظفر علی خاں نے لارڈ کرزن کی کتاب پرشیا کا ترجمہ اردو میں 'خیابانِ فارس' کے نام سے کیا اور داغ سے اردو نشر میں اس کی تقریظ لکھوائی۔ داغ اگرچہ انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن ایک دوسری غیر ملکی زبان یعنی فارسی جاننے کی وجہ سے انھیں ترجمے کے کام کی نزاکتوں اور دشواریوں کا بخوبی اندازہ تھا۔ اس مختصر سی تقریظ میں انھوں نے ترجمے کے فن کے بارے میں دو باتیں بڑے پتے کی کہی ہیں ایک تو یہ کہ 'زبانِ غیر کا ترجمہ اپنی زبان میں مجسّم کرنا آسان بات نہیں اور دوسرے یہ کہ ترجمہ ایسے ہو کہ نصف کا اصلی مقصد بھی قوت نہ ہو اور زبان کا لطف بھی ہاتھ سے نہ جائے۔

داغ کے بارے میں اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ داغ کے کمالات صرف شاعری تک محدود نہیں ہیں ان کے کمالات میں شاعری کے علاوہ اور بہت سی چیزیں شامل ہیں جن کی جانب یہاں ہلکے سے اشارے کیے جا چکے ہیں۔ داغ دہلی کی زبان اور روزمرہ کے آخری بڑے شاعر تھے انھیں فکر تھی کہ زبانِ دہلی مٹتی جا رہی ہے اس لیے ان کے ہاں دہلی کی زبان، دہلی کے محاورے اور دہلی کے روزمرہ کے تحفظ کا شعوری احساس تھا۔ ان کی غزلوں کے سولہ ہزار شعروں میں سے منتخب داغ کے چھ ہزار شعر ایسے ہیں جو عطف و اصناف سے پاک ہیں اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ داغ کی زبان دہلی کے روزمرہ سے عبارت ہے۔ زبانِ دہلی کے تحفظ کے خاطر ہی داغ اس بات

کے لیے بے چین رہے کہ فصیح اللغات کا کام کسی طرح مکمل ہو جاتا لیکن اُن کی یہ
 آرزو پوری نہ ہو سکی۔ اقبال اس صدی کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ قطعہ نظر
 اس بات کے کہ اقبال کو بھی داغ سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ اقبال کا انداز فکر اور
 طرز بیان داغ سے بالکل مختلف تھا لیکن اقبال نے داغ کو بہترین خراج عقیدت
 پیش کیا ہے۔ اقبال کا یہ مصرع داغ کے مزاج کی بھرپور عکاسی کرتا ہے
 آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

کتابیات

- ۱- اردو ادب سے ماہی، مطبوعہ علی گڑھ، ستمبر ۱۹۵۶ء
- ۲- انشائے داغ، مرتبہ احسن مارہروی، انجمن ترقی اردو دہلی، دہلی ۱۹۴۱ء
- ۳- بزم داغ، مرتبہ رفیق مارہروی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۵۶ء
- ۴- جلوہ داغ، احسن مارہروی
- ۵- زبان داغ، مرتبہ رفیق مارہروی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ ۱۹۵۶ء
- ۶- منتخب داغ، مرتبہ احسن مارہروی ۱۹۴۱ء

اردو
انشا
بزم
جلوہ
زبان
منتخب

مخفف:

”
”
”
”
”
”

ڈاکٹر کامل قریشی

داغ کی غزل گوئی

نواب مرزا خاں داغ دہلوی کی غزل گوئی کے محرکات کا جائزہ لینے کے لیے ان کے گرد و پیش کے حالات پر نظر ڈالنی ہوگی۔ داغ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو چاندنی چوک دہلی میں پیدا ہوئے، ان کی والدہ وزیر بیگم المعروف بہ چھوٹی بیگم ایک کشمیری النسل محمد یوسف کی لڑکی تھیں۔ داغ کے والد نواب شمس الدین احمد خاں دہلوی فیروز پور جہر کہ تھے، جن کو دہلی کے ایک انگریز ایجنٹ گورنر جنرل فریزر نے قتل کی سازش کے الزام میں سزائے موت دیدی گئی تھی۔ چھوٹی بیگم کے حسن و جمال کا دور دورہ چرچا تھا اسی طرح ان کی دوسری بہن عمدہ خانم بھی اپنی خوبصورتی کے اعتبار سے مشہور تھیں شمس الدین احمد خاں کی موت کے بعد چھوٹی بیگم آغا تراب علی کے گھر بیٹھ گئیں پھر ان سے علیحدگی اختیار کر کے ولی بہادر شاہ ظفر، مرزا فخر و سے شادی کر لی، اس شادی کے وقت داغ کی عمر ۱۳-۱۴ برس کی تھی ۱۲۱۰ھ طرح وہ قلعہ دہلی میں عند ۱۲۵۰ھ تک رہے اس دوران ان کی تربیت شاہزادوں کے ساتھ ہوئی انھوں نے وہ تمام علوم و فنون سیکھے جو بادشاہوں کی اولاد کو سکھائے جاتے تھے اس زمانے میں قلعہ معلیٰ کا ماحول شعر و شاعری

سے بھر پور تھا۔ ذوق، غالب، مومن اور دوسرے اساتذہ فکر و فن کے علاوہ خود بہادر شاہ ظفر اور شاہزادے وغیرہ شعر و ادب میں غیر معمولی دل چسپی لیتے، مخلص ہوتے، مشاعرے کیے جاتے اور ارباب علم و فن داد و سخن حاصل کرتے، ظفر کے علاوہ مرزا فخر کو بھی شاعری کا شوق تھا، اسی ماحول میں داغ کو بھی ذوق سخن پیدا ہوا، مرزا فخر کو کے مشورے پر داغ نے استاد ذوق کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا اور اس طرح قلعہ معطلے میں ان کی شاعری کا باضابطہ آغاز ہو گیا۔ قلعہ معطلے میں داغ کا داخلہ ۱۲۸۵ء میں مرزا فخر و سے ان کی والدہ کے نکاح کے ساتھ ہوا اور یہ قیام ۱۲۸۷ء تک رہا، اس درمیانی عرصے میں قلعہ کے ماحول میں رہ کر داغ کو جس لکسائی زبان کے سننے، سمجھنے اور سیکھنے کا موقع ملا اور شاہزادوں و شاہ زادیوں سے جو روزمرہ محاورات و ضرب الامثال حاصل ہوئے وہ ان کے رگ و ریشے میں اتر کر زندگی کا حصہ بن گئے اور ان کی شاعری کے قالب میں روح بن کر جاری و ساری رہے، شعر و شاعری اور لکسائی زبان کے اس ماحول کے علاوہ داغ نے رنگینوں، حسن و رعنائی، سیر و تفریح، عیش و عشرت اور کیفیت و سرور کے جو مناظر یہاں دیکھے اور جوانی کی منزل میں قدم رکھنے کے ساتھ ساتھ عیاشی سے بھری زندگی کے جو تجربات ان کو ہوئے اس میں وہ اس قدر رچ بس گئے کہ عمر بھر ان سے بچھا نہیں چھوٹا، قلعہ معطلے کے حسن و جمال کی فراوانیوں، حسین و طر حدار عورتوں کے ہجوم اور جوانی کی امنگ و ترنگ میں جو مستیاں ان کے حصے میں آئیں وہ ان کے لیے زندگی کا ایک لازمی جزو بن گئیں، ان کے بغیر زندگی کا تصور ان کے لیے، سچ تھا، بچپن سے جوانی تک کے دور میں جنس اور جنسی تعلقات کے نقوش ان کے دل و دماغ پر اس قدر سخت پڑ چکے تھے کہ روح کی گہرائیوں میں اتر گئے تھے اپنے اسی ماحول میں ان کو شباب کی لذتوں، حسرتوں، نشاط و انبساط اور عیش و عیاشی کا اندازہ ہی نہیں، بھر پور طریقے سے لطف اندوز ہونے کا موقع بھی ملا ہو گا اور عشق و عاشقی، محبوب و محبوبیت کے راز ہائے سر بستہ سے بھی وہ یہیں کی فضاؤں میں واقف ہوئے ہوں گے، خود ان کی والدہ اور خالہ کی نجی زندگیوں کے واقعات بھی ان کی نگاہ کے سامنے تھے۔ دراصل اس دور کی سوسائٹی کا کچھ رخ بھی ایسا ہی ہو چلا تھا کہ رئیس زادے اور بادشاہوں کی اولاد طوائفوں کے بالا خانوں پر تہذیب و شائستگی اور

آداب مجلسی کی تربیت کے لیے جاتے تھے اور طوائفیں بھی لگانے بجانے کے علاوہ داد عیش دینے امیرزادوں کے کاشانوں پر حاضری دیتی تھیں۔ خود بیاتہ عورتوں کے علاوہ رئیس زادوں کے یہاں داستاؤں کے طور پر طوائفیں ہوتی تھیں اور اس فعل کو رئیسوں کی شان کے شایان اور امیرزادوں کی روایات کا حصہ تصور کیا جاتا تھا۔

غدر ۱۸۵۷ء یعنی تقریباً ۲۵ برس کی عمر تک داغ نے قلعہ معلے میں رہ کر زندگی کی تمام رنگینوں، رعنائیوں اور مستیوں کے مشاہدات اپنی نگاہوں سے کیے، ان میں رہے، ان کے مزے لیے اور ان کو اپنے جسم و روح میں سمو لیا۔ غدر کے بعد جب قلعہ معلے کی بساط زندگی الٹی اور انقلاب زمانہ نے دلی کا نظام درہم برہم کیا تو داغ بھی دوسرے ارباب علم و فن کی طرح جلے، امان اور فکر معاش کے لیے رام پور نکل گئے، جہاں ان کو اعزاز و احترام سے نوازا گیا اور وہ نواب کلب علی خاں کے دور تک رام پور میں بڑے عیش و آرام سے رہے یہاں ان کو زندگی کے اور بہت سے نرم و نازک تجربات سے گزرنا پڑا۔ یہیں ان کی ملاقات بانی حجاب سے ہوئی جس کے عشق نے داغ کو مثنوی فریاد داغ، کی تخلیق پر اکسایا اور جس کی عاشقی کا جوش داغ کے دل میں کبھی سرد نہ ہو پایا یہاں تک کہ حیدر آباد کی زندگی کے آخری ایام تک مثنوی بانی حجاب ان کی جان جگر بنی رہیں اور مرتے دم تک داغ انھیں خراجِ حسن کے طور پر وظیفہ دیتے رہے۔ نواب کلب علی خاں والی رام پور کے انتقال کے بعد داغ کا رام پور سے جی اچاٹ ہوا اور وہ کچھ وقت کے لیے دہلی آئے پھر قسمت آزمائی کے خیال سے حیدر آباد گئے اور کچھ عرصے وہاں رہ کر واپس ہوئے پھر دوسری بار حیدر آباد کا سفر اس امید پر کیا کہ قسمت یادری کرے گی، ساڑھے تین سال کے انتظار کے بعد ان کی مراد برآئی اور وہ نواب محبوب علی خاں والی حیدر آباد کے استاد مقرر ہوئے اور ان کو جاہ و منصب، زر و جواہر، مال و متاع اور روپیہ پیسہ اس قدر انفرادی سے ملا کہ اردو شعراء کی تاریخ میں کسی کو میسر نہ آیا ہوگا۔ مرتے دم تک ان کو زندگی کی تمام خوشیاں، عیش و مسرت، شان و شوکت اور عزت و عظمت سے نوازا جاتا رہا اور ۱۹۰۷ء میں وہ انتقال فرما گئے۔

نواب مرزا خاں داغ دہلی کے اس سوانحی پس منظر سے یہ اندازہ لگانا مقصود تھا کہ وہ

پر ایک کل ہندو سیمینار منعقد کیا جائے تاکہ جہاں ایک طرف اُن کے کارہائے نمایاں کی تعریف و
 توصیف کی جائے تو دوسری طرف اُردو کی نئی نسل کو اُن کی ذات و صفات سے متعارف
 کیا جاسکے چنانچہ اس نیک جذبے کے تحت ۱۰ فروری ۱۹۵۵ء کو دہلی اُردو اکادمی کے
 زیر اہتمام غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین (ولیسٹ) نئی دہلی میں دو روزہ سیمینار بڑے
 تزک و احتشام کے ساتھ منعقد کیا گیا اپنے موضوع، مقصدیت، شرکائے خاص اور حاضرین
 کے اعتبار سے اس کی حیثیت ایک یادگار اجتماع کی تھی۔ اس موقع پر داغ کی حیات و
 خدمات کے مختلف پہلوؤں پر دلچسپ، پراز معلومات اور قابل تعریف مقالے پڑھے گئے
 مقالہ نگار حضرات کے طور پر ملک کے مشہور ناقدوں، محققوں اور نامور اربابِ قلم نے
 حصہ لیا جن کی نظر داغ، اُن کے فکر و فن اور زبان و ادب پر نہایت گہری ہے۔ ان میں
 پروفیسر طہیر احمد صدیقی نے داغ کے نظریہ فن سے بحث کرتے ہوئے اپنے ناقدانہ
 خیالات کا اظہار کیا، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے داغ کی حیاتِ معاشرۃ، پر نہایت پُر لطف
 اور دلکش انداز میں داغ کی داستانِ عشق پر سے پردے اُٹھائے، ڈاکٹر خلیق انجم نے
 داغ کی شخصیت اور سیرت کے مختلف پہلوؤں کو اپنے خاص طرزِ بیان کے ذریعہ اجاگر
 کیا۔ پروفیسر گلن ناتھ آزاد نے ”داغ کے اثرات اقبال پر“ کے عنوان سے داغ اور اقبال
 کے شاعرانہ رشتے پر مفصل روشنی ڈالی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی نے ”مکاتیب داغ کے
 موضوع پر داغ کی مکتوب نگاری کی اہمیت کا اظہار کرتے ہوئے ایک جامع مقالہ پڑھا،
 ڈاکٹر سیدہ جعفر کے مقالہ کا عنوان تھا داغ حیدر آباد میں، جس میں اُنھوں نے داغ کے
 زمانہ قیام حیدر آباد کی سرگرمیوں، دلچسپیوں اور کامیابیوں سے بھرپور داستان
 کو بڑے خوبصورت انداز سے پیش کیا، ڈاکٹر اسلم پرویز نے اپنے مقالے ”داغ اور مذاق سخن“
 کے ذیل میں سخن و خوبی اپنے تفصیلی خیالات کا اظہار کیا، سید ضمیر حسن دہلوی نے بعنوان
 ”خصوصیات کلام داغ“ زبان و محاورہ وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی، ڈاکٹر مفیث الدین فہدی
 نے ”داغ کی تاریخ گوئی“ پر روشنی ڈالتے ہوئے داغ کی تاریخ گوئی کے نمونے پیش
 کیے، جناب آنند موہن زرتشی گلزار دہلوی نے اپنے مقالے میں ”داغ کے دہلوی تلامذہ“

جس ماحول میں پیدا ہوئے، پہلے بڑھے، پروان چڑھے اور اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی اس ماحول نے اپنے تمام تر ناگفتہ بہ سماجی حالات اور معاشرت کی خرابی و خستہ حالی کے باوجود دماغ کو جو کچھ دیا وہ عیش و عشرت سے لطف اندوز ہونے کی خواہش، حسن و جمال کی رعنائیوں سے لذت حاصل کرنے کی تمنا، کیف و مستی کی فضاؤں سے سرور لینے کی آرزو، بھرپور شباب کی رنگینیوں میں ڈوبے رہنے کی ہوس اور جنسی خواہشوں کے غلبے کے تحت حسین اور طر حدار عورتوں کی جوانی سے تلمذ حاصل کرنے کی حسرت ہی ان کے لیے سب کچھ تھی، اٹھارویں صدی عیسوی کے اداس سے ۱۹ویں صدی عیسوی کے وسط تک سیاسی و سماجی طور پر ملک کو جس انحطاط سے گزرنا پڑا تھا اور معاشرہ جس منزل پر آگیا تھا اور ایسے عالم میں جب کہ اصلاح کی صورت ناممکن نظر آتی تھی۔ سماج دو طبقوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک طبقہ دنیا کا زوال دیکھتے ہوئے تو بہ استغفار میں لگ گیا تھا اس نے خانقاہیں آباد کر لی تھیں۔ قیامت کے ڈر سے عبادت الہی میں مصروف تھا تو دوسرا طبقہ مٹی ہوئی دنیا کی بہار لوٹ لینا چاہتا تھا، اس کے کیف و مستی میں غرق ہو کر ہوش میں آنا نہیں چاہتا تھا اور زندگی سے جس قدر عیش و عشرت مل سکتی تھی حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ دماغ کا تعلق اس دوسرے طبقے سے تھا وہ اس بات کے قائل تھے کہ زندگی متنسے متنسے، تہمتہ لگانے، مزہ لینے اور ہر حال میں جینے کے لیے ہے۔ زندگی کا موقع صرف ایک بار ملتا ہے اگر اسے بھی رو دھو کر، غم و الم میں مبتلا کر یا سنجیدگی کے بارے میں دب کر گزارا جائے تو ایسی زندگی موت سے بدتر ہے اس لیے جیو تو آن بان اور شان سے جیو اور جب تک وقت و اجازت دے، زندگی کی بھرپور بہار کے مزے لوٹو، دماغ کی زندگی کے ان عملی پہلوؤں کو ان کی شاعری کے پس منظر میں رکھ کر اگر جائزہ لیا جائے تو کلام دماغ کو سمجھنے اور خاص طور پر اُن کی غزل گوئی کے صحیح مطالعہ کا حق ادا ہو سکے گا۔

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کا قول اس سلسلے میں قابل غور ہے۔

”دماغ کی شاعری میں شبابیات، عیاشی و ہوسناکی اور کھل کھیلنے کا انداز ہے تو اس کی ایک حقیقت ہے یہ تجربات اُن کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کے اظہار میں دماغ نے ایک کیفیت پیدا کر دی ہے

جو لطف سے خالی نہیں۔“ لہ

برآغ کے اسی ذوق شبابیات، عیاشی و ہوسناکی اور کھل کھیلنے کے انداز ہی کا اثر ہے کہ ان کی شاعری اور خاص طور پر غزل کے اشعار میں چھڑ چھاڑ، پھین چھپٹ، لاگ ڈانٹ، طعنہ تشنیع، چلبلاہٹ، شوخی و طعاری، زندہ دلی اور زندگی ہی زندگی ہر طرف موجزن ہے۔ وہ ایک خوشباش ہنسور، بذلہ سنج، حاضر جواب، ذہین، طبائع اور عیش و عشرت میں مگن رہنے والے آدمی تھے۔ وہ عمر کا ایک ایک لمحہ ہنس ہنس کر اور غم والے سچ بچا کر گزارنے کا فن جانتے تھے وہ نہ تو خود غم تھے نہ بے فکرے اور نہ حالاتِ زمانہ کی کٹافٹوں سے ناواقف، نہ انسانوں کے دکھ درد سے بیگانہ، وہ دنیا و زندگی کے اتار چڑھاؤ سے قطع نظر زندگی کی ابدی خوشیوں کی منزل تک پہنچنے کی دھن میں رہتے تھے زمانہ ان پر معترض ہو کر کہتا تھا کہ وہ ادب باش، عیاش، بدچلن، عیش پرست اور نہ جانے کیا کیا ہیں انھوں نے شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا ہے

پوچھے کوئی تو حضرت واعظ سے اتنی بات

ایسے ہی تھے جناب بھی عہدِ شباب میں

وہ اپنی افتادِ طبع اور زندہ دلانہ روش کے پیش نظر کہتے ہیں

ہنسی مرنے کا اپنے غم، یہ غم ہے

کہ پھر آنا نہ ہو گا اس جہاں میں

وقت آخر ہوا مگر اے داغ

ہوسِ زندگی نہیں جاتی

وعدہ حشر آپ کرتے ہیں

چار دن بعد یہ شباب کہاں

اپنے دم کو آدمی ہر دم غنیمت جان لے
خاک کا پھر ڈھیر ہے بعد فنا کچھ بھی نہیں

دن گزارے عمر کے انسان ہنستے بولتے
جان بھی نکلے تو میری جان ہنستے بولتے

فسردہ دل کبھی خلوت نہ انجمن میں رہے
بہار ہو کے رہے ہم تو جس چین میں رہے

ان اشعار کے نقل کرنے سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ داغ حقائق زندگی کے صرف ایک رخ سے ہی واقف تھے ان کے سامنے غم و الم کا پہلو نہ تھا یا وہ اتنے بے حس تھے کہ انہیں اپنی دنیا کے حالات کا اندازہ نہ تھا، لیکن وہ میر نہ تھے جو غم و الم کو سینے سے لگائے بیٹھے رہتے، نہ فانی ہی تھے جو یاسیت کے شکار ہو جاتے وہ ایک ایسے انسان تھے جس کی نظر میں زندگی کے تمام لطفت و کیفیت پہلو تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنے زمانے کی خامیوں اور خرابیوں پر شہر آشوب کیسے لکھ پاتے، وہ تمام تر آرزوؤں کے حصول کے لیے کبھی روئے نہیں اٹھوں نے کل کے انتظار میں آج کو ضائع کرنا نہیں سیکھا تھا وہ آج کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونا اور کل کی دولت اگر مل جائے تو خوب، ورنہ کوئی بات نہیں، پر عمل کرتے تھے اُن کی پوری شاعری کا لہجہ اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

داغ نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت غالب، مومن، ذوق اور بہادر شاہ ظفر کی شہرت عروج پر تھی قلعہ کے اندر اور یاہر ان شعراء کے فکر و فن کا طوطی بول رہا تھا۔ غالب فلسفیانہ مضامین اور مسائل تصوف کے باب میں بیان کے دریا بہا رہے تھے مومن، بھرپورہ نشین بن زندگی کو پر وہ در کیے ہوئے تھے۔ ذوق زبان و محاورے کو جلا دینے میں مصروف تھے۔ ظفر تقلید ذوق میں سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف و قافیہ میں طبع آزمائی کر رہے تھے اور اُن کی پیروی میں اُس دور کے بہت سے شاعر مشق سخن میں لگے تھے داغ بھی ایک

حد تک حالات کے مطابق تقلیدی اور روایتی رنگ کے ساتھ ساتھ چلے لیکن ان کی افادہ طبع اور ذہن رساتے بہت جلد پہچان لیا کہ اگر اس طرح تقلیدی رنگ جاری رہا تو وہ دنیائے فکر و فن کو انفرادی طور پر اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں گے اس لیے انھوں نے صرف مذکورہ شعراء کے رنگ ہی سے خود کو آزاد نہ کیا بلکہ نہ تو انھوں نے میر کی غم و الم کی راہ اپنائی، نہ درد کی صوفیانہ روش پر چلے، نہ سودا، انشا اور مصحفی کی تقلید کو روا رکھا، نہ طرزِ جبرأت و رنگین کی پیروی پسند کی اور ان سب کی عظمتوں کے قائل ہوئے اور مقتدین و معاصرین کی زمینوں میں طبع آزمائی کرنے کے باوجود اپنی راہِ سخن اور طرزِ نگہ نگار الگ نکالی جو ان سے شروع ہوئی اور انہی پر ختم ہو گئی۔

دآغ نے غزلوں کے علاوہ مثنوی، قصیدہ، قطعات، رباعیات، محسنات اور مہدس وغیرہ سب اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کر کے دادِ سخن حاصل کی ہے لیکن جو بات ان کی غزلوں میں ہے وہ کہیں نہیں، غزل میں وہ کھل کھیل کر سامنے آتے ہیں مثنویوں میں فریادِ دآغ، جو مٹی بانیِ حجاب کے عشق میں ڈوب کر انھوں نے کہی تھی بہت مشہور ہوئی لیکن ان کی تمام شاعری پر جتنی گہری چھاپ غزل کی ہے وہ اپنا جواب آپ ہے ان کی پوری شاعری کے مقابلے میں غزل کے دآغ کی جلوہ نمایاں کچھ اور ہی ہیں۔ میر و مرزا سے غالب و ذوق تک یوں تو غزل کے مضامین میں عام طور پر وہی روایتی اندازِ وہی لہجہ و وہی ہجو وصال، وہی عشق و عاشقی، وہی رقیب، ناصح، واعظ، زاہد سے چھیڑ چھاڑ وہی معشوق سے گلے شکوے، وہی محبوب کی بے وفائیاں اور عاشق کی وفائیں، وہی عشوے، غمزے، ناز، نخرے، وہی شراب و شہادہ، وہی جام و مینا وہی رند و صوفی، وہی عذاب و ثواب، غرضیکہ ایسی ہی باتیں تھوڑے تھوڑے اندازِ بیان کے اختلاف کے ساتھ شعرا بیان کرتے چلے آ رہے تھے جس کے خلاف حاکمی نے مقدمہٴ شعر و شاعری میں آواز بلند کی تھی اُس دور کے تقلید چرچت شعراء نے جھوٹا عشق کرنا، معشوق کو طعنے دینا، واعظ، زاہد، محسب اور ناصح کو مطعون کرنا اور پٹی پٹائی باتوں کو از سر نو دہرانا اپنا شعار بنا لیا تھا جس سے شاعری کی مضا مسموم ہو رہی تھی اور نئے خیالات، پاکیزہ جذبات اور تازہ مضامین تو لانا درکنار بیان کی گئی باتوں کو دہرانے کے سلیقے کا بھی فقدان تھا۔ ایسے عالم میں دآغ کی غزلیں مہارا

بنیں اور اردو کی آبر دہکنے سے بچ گئی۔

دآغ کے خاندانی حالات، نواب شمس الدین احمد خاں کے اثرات، اُن کی ماں اور خالہ کی نجی زندگی کے نقوش، دآغ کے عشق، قلمہ معنی کے ماحول میں اُن کا حسین و طر حدار عورتوں سے میل جول، رام پور کی عشق و عاشقی اور طوائفوں سے ربط و ضبط، منی بانی بچا، اختر جان، صاحب جان اور عمدہ جان وغیرہ سے ان کی خلوت و جلوت کی قربتیں، حیدر آباد کے قیام کی فارغ البالی، اُن کی محرومیاں، ناکامیاں اور کامیابیاں، عزت افزائیاں، ان سب سے مل کر دآغ کی شاعری کا پیکر تیار ہوتا ہے جس کی گونج اُن کی غزلوں میں جگہ جگہ سنائی دیتی ہے یہ تسلیم کہ غزلوں میں اُنھوں نے جن باتوں کا اظہار کیا ہے ان سے اُن کی شاعری معراج کمال پر تو نہ پہنچ سکی لیکن اس سے ان کی آواز میں ایک کھنک اور ان کے رنگ و آہنگ میں گرج ضرور پیدا ہو گئی ہے جسے سن کر ذہن چونک اٹھتے ہیں اور دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ ارد و غزل میں مومن کی ایک آواز ایسی ہے جس نے محبوب کو متوجہ کیا لیکن مومن نے محبوب سے مخاطب کے وقت جن تیوروں سے کام لیا ہے اُس نے محبوب پر اثر کم کیا اور وہ دشمن زیادہ ہو گیا، لیکن دآغ معشوق کے ساتھ جس خود داری، جس طنطنے اور جس وقار کے ساتھ ہم کلام ہوتے ہیں اُس سے عشق کو آبر و اور عاشق کے کردار کو عظمت ملی ہے دآغ کی نظر میں اگر حسن کو خود پرنا ز ہے تو عشق بھی کسی سے پیٹا نہیں اُسے بھی اپنی ذات پر فخر ہے اُن کی غزلوں میں اس عزت و وقار اور عظمت و افتخار کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں مثلاً

جواب اس طوق سے بھی فی الفور ہوگا
دبے آپ سے وہ کوئی اور ہوگا

ناروا کہیے ناسزا کہیے
کہیے کہیے مجھے بُرا کہیے

معشوق کا تو جرم ہو عاشق خراب ہو
کوئی کرے گناہ کسی پر عذاب ہو

یہ کیا کہا کہ داغ ہے تو کس شمار میں
 لکھا ہوں میں ہزار میں کیا سو ہزار میں

تم کہتے ہو معشوق اطاعت نہیں کرتے
 عاشق بھی تو معشوق کا نوکر نہیں ہوتا

کیا ملے گا کوئی حسیں نہ کہیں
 دل بہل جائے گا کہیں نہ کہیں
 کیا سمجھتے ہو تم اپنے آپ کو خوب رویوں سے جہاں خالی نہیں
 ملاتے ہو اُسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے
 مری جاں چاہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے

کون ہوتا ہے کڑی بات کا سہنے والا
 گالیاں تم کو سکھا دیں یہ دعاد مجھ کو

چاہت کا مزہ بعد ہمارے نہ ملے گا
 ہر شخص سے تم آپ کہو گے ہمیں چاہو

تم نے بدلے ہم سے گن گن کے لیے
 ہم نے کیا چاہا تھا اس دن کے لیے

محبوب کو منانے، رچھلانے اور اپنے دام میں لانے کے لیے شعرائے غزل نے نہ جانے کیسے کیسے
 پیرایہ بیان اختیار کیے ہیں اس کے سامنے اپنی اہمیت جتانے، اُسے اپنی قدر و قیمت کا
 احساس دلانے، اُسے رقیب و رسیاہ اور اغیار کے نرغے سے نکالنے کے لیے کیا کیا جتن

کیے گئے ہیں لیکن اس میدان میں داغ کا انداز ہی نرالا ہے ان کے بیانوں میں کتنی دلکشی،
کتنا خلوص اور صداقت مھلکتی ہے جب وہ محبوب سے اس طرح ہمکلام ہوتے ہیں۔

تھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو
اور ہوتی ہے خطا دار کی صورت کیسی

تم کو چاہا تو خطا کیا ہے بتادو مجھ کو
دوسرا کوئی تو اپنا سا دکھادو مجھ کو

آپ کے سر کی قسم داغ کو پر دا بھی نہیں
آپ سے ملنے کا ہو گا جسے ارماں ہو گا

تم کو ہے وصلِ غیر سے انکار
اور جو ہم نے آکے دیکھ لیا

آج اُن کے بھید اس صورت سے ظاہر ہو گئے
غیر کا مذکور آیا تھا کہ ترہ بھی ہو گئے

معشوق اور اس کے خسریدار ہو گئے
اب داغ تیرے ہاتھ سے اے رشک مہ گیا

جو گزرتے ہیں داغ پر صدے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

تھیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع، یہ ترکیب
ہمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈھال دیا

کیا کہا؟ پھر تو کہو، ہم نہیں سنتے تیری
نہیں سنتے تو ہم ایسوں کو سناتے بھی نہیں

غزل میں ہر چند کہ داغ کا انداز بیان مومن سے تیکھا اور بانکا ہے لیکن وہ مومن سے بڑے
شاعر نہیں، داغ کی طرح مومن نے بھی اپنے محبوب کو جلی کٹی سنائی لیکن مومن اور داغ کے
تجربات اور معاملات عاشقی میں بڑا فرق ہے مومن عشق پر وہ نشیں ہیں کچھ ایسے کھل کھیلے
تھے کہ عشق کی پردہ داری ہوئے بغیر نہ رہی جبکہ داغ نے معاملات عشق کے اظہار میں جس
احتیاط سے کام لیا ہے وہ اُنہی کا حصہ ہے مثال کے طور پر ”فریاد داغ“ کو پیش نظر رکھا
جاسکتا ہے داغ نے اپنے چہرے پر کبھی کوئی مصنوعی نقاب نہیں ڈالا نہ اُنھوں نے اپنے جسم
پر کوئی اور خول چڑھایا وہ جیسے تھے ویسا ہی اُنھوں نے خود کو پیش کیا اُنھوں نے محبوب سے
اظہار مطلب کے وقت تصنع، تکلف، بناوٹ اور دردِ گوئی سے کام نہیں لیا جو کچھ اُن کے
دل میں تھا اُسے صداقت، اصلیت اور حقیقی انداز سے پیش کر دیا اور وہ بھی اس قدر بے تکلفی
اور صاف گوئی کے ساتھ کہ دل کو واقعتاً کالیقین ہونے لگتا ہے شاعری میں جنسی تلذذ پیدا
کرنے کے لیے شعراء نے نئے نئے انداز سے اظہار خیال کیا ہے یہ کام غزل میں جراتِ انشاء
رنگین اور آبرو نے بہت کھل کر انجام دیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان شعراء کو شاید
جنسی تلذذ سے کبھی واسطہ ہی نہیں رہا، جس کے سبب اُنھوں نے جنسی بھوک پوری کرنے کے
لیے شاعری میں نئے نئے کرب دکھائے ہیں۔ جب کہ داغ جنس کی اُن تمام منزلوں سے گزر
چکے تھے اور حسین و طرحدار عورتوں کے ہجوم میں اُنھوں نے زندگی کے تمام تجربے کر لیے
تھے اور ان کے لیے خوبصورت چہروں میں جنسی دلکشی وہ نہیں رہی تھی جسے دوسرے
نعمت و دولت تصور کرتے ہیں۔ داغ کہتے ہیں

عشق بازی میں نئے حاصل ہوئے ہیں تجربے
داغ نے دیکھی ہیں دنیا سے نرانی صورتیں



**THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM**

**LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.**

جلوے مری نگاہ میں کون دمکال کے ہیں
 مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں
 داغ نہ فلسفی تھے نہ صوفی اور نہ کوئی بڑا نظریہ حیات رکھتے تھے وہ صرف شاعر تھے اور وہ بھی
 جذبات کے شاعر۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جذبات کا جس انداز سے اظہار کیا ہے وہ قابل
 غور بھی ہے اور لائق داد بھی وہ دنیا کی لذتوں سے محفوظ ہونے اور زندگی کا صحیح تلذذ حاصل
 کرنے کے لیے ساری عمر کو شان رہے ایک عاشق مزاج، شاہد باز اور دل پھینک رند لاابالی کے
 طور پر تاحیات ہر اس شے سے پیار کرتے رہے جو انھیں حسن کی بارگاہ سے ہاتھ لگی اچھی سے اچھی حسین
 صورتوں کی تلاش انھیں زندگی بھر رہی جنسی آسودگی حاصل کرنے کی طاقت نہ ہونے کے
 باوجود اور ہاتھ کو جنبش نہ ہونے کے باوجود صرف آنکھوں ہی میں دم ہونے کے سبب وہ
 پیمانہ دھیماپنے سامنے رکھے رہنا چاہتے تھے اس لیے مرتے دم تک حسین عورتوں کے ہجوم میں
 رہے، مرنا اور دنیا چھوڑ کر عقبی کی طرف جانا انھیں پسند نہ تھا وہ دنیا کے دلدادہ تھے
 کل کے مقابلے میں آج کے متوالے تھے اور دیکھی ہوئی چیزوں کے مقابلے میں ان دیکھی چیزوں
 پر یقین نہیں رکھتے تھے یہی ان کی زندگی تھی اور یہی اس کا فلسفہ، یہ خیالات ان کی شاعری
 میں جگہ جگہ ملتے ہیں مثلاً

کیوں آدمی کو عالم بالائی ہو ہوس
 بڑھ کر نہیں زمین سے کچھ آسمان کی سیر

فرشتے بھی دیکھیں تو کھل جائیں آنکھیں
 بشر کو وہ جلوے دکھائے گئے ہیں

بہت جلائے گا حوروں کو داغ جنت میں
 بغل میں اُس کے دہاں ہند کی پری ہوگی

کرتا یہ کارخانہ دنیا میں کچھ نہ کچھ انسان کو پڑی ہوئی روزِ جزا کی ہے

ہجود، سائل، آغاشاعر اور زار دہلوی کے حالات، واقعات اور خدمات پر مفصل تبصرہ کیا، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے دُآغ لال قلعہ میں، کے عنوان سے لال قلعہ میں دُآغ کی زندگی اور اُن کے گرد و پیش کے حالات پر بڑے پُر لطف انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا، دُآغ کا دبستانِ شاعری، کے موضوع پر ڈاکٹر صلاح الدین نے تفصیلی اظہار رائے کرتے ہوئے دُآغ اور اُن کے دبستان کی خصوصیت اور مقبولیت سے بحث کی۔ راقم الحروف نے دُآغ کی غزل گوئی کی عظمت، اہمیت اور محاسن پر نظر ڈالتے ہوئے مثالوں سے اس موضوع پر مفصل روشنی ڈالی۔

غرض یہ کہ دُآغ کے فن اور شخصیت کے ان جملہ موضوعات پر مذکورہ قلم کاروں نے اپنے اپنے انداز و نقطہ نظر سے بھرپور انصاف کرنے کی کوشش کی، جو اس اعتبار سے بہت مستحسن ہے کہ دورِ وزہ سیمینار میں دُآغ کی زندگی اور فکر و فن سے متعلق تمام گوشے نمایاں ہوئے اور اس طرح عہدِ حاضر کی نسل کو دُآغ اور اُن کے حالات کو سمجھنے، اُن سے صحیح طرح متعارف ہونے اور اُن کی شعری، ادبی اور لسانی خدمات کو سمجھنے کا موقع ملا، ان مقالات کو اب ایک کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے تاکہ مطالعہ دُآغ کے شوق میں ان کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جاسکے۔

اس سلسلے میں اردو اکادمی دہلی اور اس کے اربابِ حل و عقدِ اردو دنیا کی مبارکباد اور شکر یہ کہ مستحق ہیں کہ اُنھوں نے اس طرح اردو زبان و ادب کے سب سے بڑے مجتہد دُآغ دہلوی کی یاد کو تازہ کرتے ہوئے ذکر و فکر دُآغ کے نئے دروازے کھولے تاکہ اردو کی نئی نسل مطالعہ دُآغ کا سامان فراہم کر سکے اور دُآغ کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اُن کے اس دعوے کی تصدیق کر سکے کہ

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں دُآغ
ہندوستان میں دھوم ہماری زباں کی ہے

خواب میں دیکھ لیا خلد کو ہم نے داعظ
اجی بس بیٹھو وہاں لطف بشر کچھ بھی نہیں

شوق میں جنت کے ہے مٹی خراب
چین سے دنیا میں کیا آدم رہے

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کا کیا کرے کوئی

کون تسنیم کے چھینٹوں پر عبث شاد رہے
کچھ کمیاں بھی نہیں مسکدہ آباد رہے
دآغ عشق کے معاملے میں اس بات کے قائل تھے۔

تو ہے ہر جائی تو اپنا بھی یہی طور سہی
تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی
آنکھوں نے جس سے عشق کیا ٹوٹ کر کیا، خوب مزے لیے اور ایک حد تک بھر پور طریقے
سے اس معشوق سے نبھایا جس پر وہ مرے، لیکن جب اس نے تیور دکھانے شروع کیے
تو دآغ نے بھی اس کا جواب تلاش کر لیا، منی بانی حجاب، اختر جان، عمدہ جان اور نہ جانے
کتنی حسین و طر حدار عورتوں کے ساتھ ان کے عشق کی منزلیں اسی طرح طے ہوئی ہیں ان
منزلوں نے دآغ کے یہاں گہرا مشاہدہ، تجربہ اور اثر پیدا کیا ہے وہ کہتے ہیں
یاں تو نبھا ہے جاتے ہیں عشق بتاں کے ساتھ
زاہد بیڑ لیں گے وہاں کی وہاں کے ساتھ

مٹ گئے عشق میں گھر سینکڑوں دیراں ہو کر
پھر گئی آنکھ تیری گردش دیراں ہو کر

کہو، کیا کزد گئے میرے وصل کی
جو مشہور جھوٹی خبر ہو گئی

لے شب وصل غنیر بھی کاٹی
ہم کو تو آزمائے گا کب تک

تم کو چاہا تو خطا کیا ہے بتادو مجھ کو
دوسرا کوئی تو اپنا سادکھادو مجھ کو

کب تک کھینچے رہو گے کب تک تنی رہے گی
کس کی بنی رہی ہے کس کی بنی رہے گی

داغ کے عشقیہ جذبات پر ان کے ایک نقاد کا بیان ہے

”عام طور پر یہ عشقیہ جذبات ہی ہوا کرتے ہیں جو ایک سیال حالت میں
داغ کی غزلوں میں دوڑتے پھرتے ہیں جنہیں طرح طرح سے رنگ بدلتے دیکھ
کر پڑھنے والا کبھی بچوں کی طرح اچھل پڑتا ہے کبھی آزر دہ ہو جاتا ہے کبھی ان
حالات کو اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈھونڈنے لگتا ہے اور کبھی داغ کی بے پایا
شہرت مگر ان کی شاعری میں تفکر کی کمی اسے مایوسی کا شکار بنا دیتی ہے۔
احساسات کی گہرائی اور فکری عناصر ان کی غزلوں سے مجموعی طور پر ہمیشہ دور
نظر آتے ہیں مگر ان کی غزلیں پڑھنے والے کی کشش کا مرکز بنی رہتی ہیں“ بلکہ
اس کا خاص سبب یہ ہے کہ زندگی میں جن باتوں کو انھوں نے عملی طور پر برتنا ان کا اظہار
اپنی غزلوں میں کھل کر کیا ہے اور وہ بھی ایک خاص انداز بیان میں جو خود ان سے مخصوص

ہے اور جس نے سنا وہ ان کا دیوانہ ہو گیا یہ انداز بیان ان کو اپنی طبیعت کے بے ساختہ پن اور چو پچال پن سے ملا، اُن کی زندگی میں بے ساختہ پن، حاضر جوابی اور ادب آداب کا لحاظ و احساس شدت کی حد تک موجود تھا، وہ کھرے انسان تھے کھری بات کرنا جانتے تھے اس لیے تکلفات کے پردے اُن کی شاعری میں نہیں ملتے، زندگی میں جو کچھ رونما ہوتا اُس کو بے تکلفی سے بیان کر دیتے اور وہ کبھی سیدھی سادی زبان اور پیارے انداز بیان میں، وہ میر کی طرح ایسے تنک مزاج نہ تھے جن کو اپنے فن کی عظمت کا اس حد تک احساس تھا کہ اُسے کسی قیمت پر بیچنا گوارا نہ تھا داغ کے نزدیک حصول مطلب کا ذریعہ صرف شاعری تھا جس کی قیمت حاصل کرنے کا فن اُنھیں معلوم تھا اور یہ بات اُن کے ذہنی پس منظر میں ہمہ وقت رہتی تھی اس لیے بڑے بے دھڑک انداز سے وہ سب باتیں کہہ جاتے تھے جو اُن کے دل میں موجود ہوتی تھیں مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔

اے اے ہم نے لپٹ کر بوسے
وہ تو کہتے رہے ہر بار یہ کیا

ہم ساتھ ہو لیے تو کہا اُس نے غیر سے
آتا ہے کون اس سے کہو یہ جدا چلے

جلوے کے بعد وصل کی خواہش ضرور تھی

وہ کیا رہا جو عاشق دیدار ہی رہا

عام طور پر شعراء نے ناصح، دشمن، غیر، داعظ اور غاب و زاہد کے ساتھ نت نئے انداز سے چھیڑ چھاڑ کی ہے اور اُنھیں ہر طرح نشانہ بنایا ہے مطعون کیا ہے داغ نے ان کرداروں کے ساتھ صرف چھیڑ چھاڑ ہی نہیں کی اُن کے دلوں کو ٹٹول ٹٹول کر کہیں کہیں ہمدردی، دوستی اور افسوس کا اظہار بھی کیا ہے جو غزل کے اظہار میں ایک نئی بات ہے مثلاً

کچھ اور دل لگی نہیں اُس خوش رقیب سے
ہم جانتے ہیں کھیلے ہو تم رقیب سے

بلائے عشق تو دشمن کو بھی نصیب نہ ہو
مراقیب بھی رویا گلے لگا کے مجھے

۱۔ وہ اس ادا سے وہاں جا کے شرمسار آیا
رقیب پر مجھے بے اختیار پیار آیا

کچھ تذکرہ رنجش معشوق جو آیا
دشمن کے بھی آنسو نکل آئے میرے آگے

اس قسم کے اشعار اُن کے یہاں بیشتر جگہ موجود ہیں دشمن، غیر اور رقیب کی طرح داغ معشوق کی نفسیات سے بھی خوب واقف ہیں۔ اُس کو بھی وہ ایک گوشت پوست کا انسان تصور کرتے ہیں اس کی مجبوریاں اور محرومیاں بھی داغ کی نظر میں ہیں چنانچہ محبوب کے ظلم و ستم، بے وفائیوں سفاکیوں اور دلازاریوں کو آنکھوں میں رکھنے کے باوجود اسے مطعون نہیں کرتے اور یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں میں ہجر و فراق کے گلے شکوے کے سائے زیادہ گہرے نہیں۔

داغ نے معاملات عشق و عاشقی کے اظہار کے لیے جو زبان استعمال کی ہے وہ بالکل ایک الگ موضوع ہے جس پر سیر حاصل گفتگو درکار ہے زبان کے وہ بادشاہ ہیں۔ دراصل اُن کی زبان ہی ہے جس میں روزمرہ و محاورات کے بے تکلف استعمال کے ذریعہ اُنھوں نے نازک سے نازک مسائل اور معاملات حسن و عشق کو اتنے سادہ و آسان انداز میں پیش کر دیا کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے وہ اس میدان میں تنہا دکھائی دیتے ہیں اگر داغ نہ ہوتے تو یہ حقیقت ہے کہ ہماری شاعری کو وہ زبان نہ ملتی جو غزل کی صورت میں ہم تک پہنچی ہے اُنھوں نے جو سادہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے اور اُسے جو چٹخارہ دیا، جس کیفیت و سرور سے مالا مال کیا کہ سننے والا وجد ہی کیا رقص میں آجائے یہ بات ہماری زبان کی تاریخ کا سنہرا باب ہے زبان کے ان نمونوں سے کچھ آپ بھی لطف لیں۔

تھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو
اور مہوتی ہے خطا دار کی صورت کیسی

کہہ چکے غیر تو افسانے سب اپنے اپنے
مجھ کو کیا حکم ہے سرکار کہوں یا نہ کہوں

فتنہ، فساد، رشک، تغافل، غرور، ناز
اس کے سوا ہے اور تیری انجمن میں کیا

نہ ہمت، نہ قسمت، نہ دل ہے، نہ آنکھیں
نہ ڈھونڈا نہ پایا، نہ سمجھا، نہ دیکھا

حفظ، تسلیم، ادب، خلق، تواضع، تعظیم
کتنی تکلیف ہے اے شوق ملاقات کے ساتھ

سادگی، یانکپن، اغماض، شرارت، شوخی
تو نے انداز وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے

چال، چکا، فقرہ، دم، جھانسنے، فریب
سیکھ جائے کوئی اُس دم باز سے

اپنی تصویر بہ ناز ادا ہو تمھارا کیا ہے
آنکھ زگس کی، دہن غنچے کا، حیرت میری

منہ اندھیرے مجھ کو غافل دیکھ کر شوخی وہ
چپکے اٹھ کر چل دیئے پہلو میں تکیہ رکھ گئے

انکارِ مے کشی نے مجھے کیا مزہ دیا
 سینے پہ اس نے چڑھ کے مئے خُم پلا دیا

تمھاری طرح بھی ہو گا نہ کوئی ہر جانی
 تمام رات کہیں ہو، کہیں ہو سارے دن

مٹ گئے ایک ہی تنافل میں
 شوق، ارمان، مدعا، مطلب

غزلوں کی پسندیدگی اور مقبولیت میں اس کے ترنم اور موسیقیت کو بہت دخل رہا ہے اس ترنم اور موسیقیت کے لیے زبان کا بڑا حصہ ہوتا ہے پھر اس کی ترین، ردیف، قافیہ اور بحر بھی بڑا رول ادا کرتے ہیں اگر یہ سب سامان فراہم نہ ہوں تو ایک اچھی غزل تیار نہیں ہو سکتی، عظیم شاعروں کی مقبولیت اور شہرت کا انحصار اپنی باتوں پر ہے جن عظیم غزل گویوں نے سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کر کے استاد کی اسلکھ چلایا ان کی استادی تو تسلیم، لیکن ان کی غزلیں عوام میں مقبول نہ ہو سکیں اس قسم کی فنی ورزش اور شعری کرتب کا انجام داغ کے سامنے بھی تھا پھر ان کو زندگی بھر ارباب نشاط سے بھی واسطہ رہا جس کے سبب موسیقی ان کی رگ رگ میں اتر گئی تھی اس لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اپنی غزلوں کو حسرت روی اور سنگلاخت کا شکار کرتے، ان کی نظر ہمیشہ مترنم و موسیقیت سے بھرپور زخروں پر رہنا ایک فطری بات تھی جس کے نمونے ان کے مختلف مجموعہ ہائے کلام میں بھرے پڑے ہیں جن کی وجہ سے ان کی غزلوں کی مقبولیت ملک کے اک سرے سے دوسرے سرے تک فوراً ہو جاتی تھی، انھوں نے بیشتر اساتذہ فن کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں لیکن جہاں ان کے انتخاب میں ایک خاص حسن سے کام لیا ہے وہاں آسان، سادہ، سہل شستہ و صاف الفاظ استعمال کر کے ان کو نہایت مترنم اور موسیقی ریز بنا دیا ہے غزلوں کے ردیف، قافیہ کی تلاش پر ان کو عبور حاصل ہے ان کی بحریں اور زمینیں نہایت باغ و بہار ہیں

ان کے یہاں الفاظ کا استعمال نہایت بر محل و برجستہ ہے، غیر ضروری الفاظ سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔ بیان کی شوخی، بے تکلفی، طنز، جذبے کی فراوانی اور تجربہ و مشاہدہ کی کثرت سے ان کی غزلیں بھرپور ہیں محاورات و ضرب الامثال، روزمرہ و تکرار الفاظ ان کے یہاں بکثرت موجود ہیں جن پر ان کی شاعری کی عمارت کھڑی ہے اور ان سب پر ان کا اسلوب بیان اسقدر دلکش، من موہ لینے والا اور پیارا ہے جو اپنا جواب آپ ہے ان کی غزلوں سے واقعیت اور داخلیت کا احساس بڑھتا ہی رہتا ہے ان کی معاملہ بندی انشاء و رنگین اور جرات کی سی نہیں وہ داغ کی اپنی ہے جس میں بے تکلفی اور سچائی ہے اور تصنع سے کوسوں دور نظر آتی ہے غزلوں میں ان کا چلبلا پن، چھیڑ چھاڑ، طنز و مزاح، شوخی و طراری وغیرہ ان کی ذہانت، طباعی، ید نہ سنجی، گہرے مشاہدے اور زندگی کے تلخ و شیریں تجربوں کی دلیل ہیں۔ داغ ایک واحد شاعر ہیں جنہوں نے اپنے علم و فضل اور فکر و فن سے ملک کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کے ارباب شعروادب کی باقاعدہ ایک دبستان کی صورت میں تربیت کی اور جس کے ذریعہ آج تک کی نسلوں کو فیض پہنچا، آج ہم جو زبان روزمرہ و محاورات بول رہے ہیں وہ سب ایک فصیح الملک کی دین ہیں غزلوں پر جس انداز بیان کے اثرات ہیں وہ ایک جہاں استاد کے دم قدم کا صدقہ ہیں اور جس تزنم، موسیقیت اور نغمگی کا آہنگ ہماری غزل کو ملا ہے وہ ایک بلبل ہندوستان داغ دہلوی کا عطیہ ہے اس لیے داغ کا یہ دعویٰ دیکھا غزل میں حرف بحرف درست ہے۔

مذکور داغ ہی کا ہر اک انجن میں ہے
اس پھول کی بہار ہزاروں چمن میں ہے

ڈاکٹر مغیث الدین فریدی

داسغ کی تاریخ گوئی

تاریخ علم بدیع کی اصطلاح میں وہ صنعت ہے جس میں کسی واقعے کا سال کسی لفظ، فقرے یا مصرع کے مکتوبی الفاظ کے اعداد کے بحساب حمل حاصل کیا جائے۔ یہ صنعت رفتہ رفتہ ایک مستقل فن بن گئی۔ اہم واقعات کے سال کو ذہن میں محفوظ رکھنے کا یہ دلچسپ وسیلہ عوام اور خواص دونوں میں مقبول ہوا۔ تاریخیں نشر کے فقرہ میں بھی ملتی ہیں۔ مگر کمتر حروف و عدد کے رشتے کا لطف شعر کے پیکر میں ڈھل کر دوبالا ہو جاتا ہے۔ اس لیے شاعروں نے اس فن پر زیادہ توجہ کی۔ منظوم تاریخوں کی مقبولیت نے فن حمل کو شعر سے مربوط کر دیا۔ اردو کے تقریباً ہر ممتاز شاعر نے کچھ تاریخی اشعار ضرور کہے ہیں۔ تاریخ گوئی سے جن اساتذہ کو غیر معمولی شغف رہا ہے ان کے نتائج فکر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک فن حمل کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں کی اہمیت بنیادی ہے اور شاعرانہ محاسن صحت زبان یا لطف و اثر کا درجہ ثانوی ہے۔ داسغ کے عہد تک آتے آتے اس فن کے اساتذہ نے اسے نئی نئی صنعتوں اور تکلفات سے آراستہ کر کے شائقین فن سے خراج تحسین حاصل کیا۔ مگر صنعت کے اہتمام اور تکلف سے تاریخ اکثر بے کیف و بے مزہ ہو گئی۔ بعض

اساتذہ نے اپنے زور طبیعت اور قادر الکلامی کے بل پر ریاضی کے قاعدوں سے کام لے کر تاریخ کو معتمہ اور چیتا بنادیا۔ اس قسم کی ذہنی ورزشوں کی مثالیں پیش کرنے میں کوئی لطف نہیں ہے۔ اس لیے سر دست صرف چند صنعتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جس سے فن تاریخ گوئی کی اس روایت کا کسی قدر اندازہ ہو سکے۔ جس سے بچ کر داغ نے تاریخ گوئی میں اپنی الگ راہ نکالی۔

صنعت اعجام :- اس تاریخ کو کہتے ہیں جس میں صرف حروف منقوطہ سے تاریخ حاصل کی جائے۔ جیسے بیت العزائے اہل بیت کی تاریخ اوج لکھنوی نے کہی ہے۔

ساخت چوں ناموس آغا حیدر جنت مکاں ایں معلیٰ بارگاہ بادشاہ کربلا
حرف منقوطی شمرده اوج تاریخش نوشت شہ بنابیت العزائے اہل بیت مصطفیٰ

(غرائب الجمل ۱۲۸۳)

اس تاریخی قطعہ کے آخری مصرع کے صرف منقوطہ حروف کے اعداد و شمار کرنے سے ۱۲۸۳ حاصل ہوتا ہے۔

صنعت اہمال :- حروف مہملہ کے اعداد سے تاریخ حاصل کرنے کو صنعت اہمال کہتے ہیں۔ اس میں اس طرح بھی تاریخ کہی گئی ہے کہ پورا مصرع صنعت اہمال میں ہو۔ جیسے عنایت حسین بلگرامی نے سرور دار دہر اہل کمال و مالک عادل سے ۱۲۶۹ حاصل کیا ہے اور صنعت اہمال میں اس طرح بھی تاریخ کہی گئی ہے۔ مصرع تاریخ کے صرف حروف مہملہ کے اعداد و شمار کر کے مطلوبہ سن برآمد کیا گیا ہے۔ جیسے اوج لکھنوی نے کسی بزرگ کی تاریخ رحلت کہی ہے۔

گفتم بحروف مہملہ سال

در قصر ارم نمود آرام

(غرائب الجمل ۱۹۹)

اس شعر کے دوسرے مصرع کے حروف مہملہ کے اعداد سے ۱۰۲۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ صنعت معنا :- رعنا گل دو رنگ کو کہتے ہیں۔ یعنی ایک مادہ تاریخ کے حروف منقوطہ اور غیر منقوطہ دونوں سے تاریخ نکلے۔ جیسے

روضہ فردوس در شک صد جمال ہر ورق

اس کے حروف منقوطہ سے بھی ۱۲۸۳ اور حروف غیر منقوطہ سے بھی۔

صنعت مقلوب :- وہ تاریخ ہے جس میں مادے کے الفاظ کو الٹنے سے وہی صورت پیدا ہو مثلاً
کاخ ہو جائے آج وہ خاک

۱۲۸۲ھ

سے ۱۲۸۲ھ نکلتا ہے۔

یہ چند صنعتوں کی مثالیں تاریخ گوئی کے ایک مخصوص رجحان کی نشان دہی کے لیے پیش کی گئی ہیں۔ ورنہ اس فن کے بالکالوں کے تکلفات کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

سفینہ چاہئے اس بحر بے کراں کے لیے

محمد علی جوایا نے دس اشعار کا قطعہ والی خیر پور سندھ کی شان میں اس دعوے کے ساتھ کہا ہے کہ میں مصرعوں میں بارہ ہزار تاریخیں نکلتی ہیں۔ واللہ اعلم۔ لیکن ہر مصرع لطف و اثر سے عاری ہے۔ اسی طرح تاریخ دانوں میں شطرنج کے نقشوں میں کچھ گئی ہیں۔ جہاں چند الفاظ کے اعداد سے مطلوبہ سن ضرور برآمد ہوتا ہے۔ مگر نہ لطف، مضمون ہے نہ تاثیر۔

مرزا داغ دہلوی نے جس طرح اردو غزل کو ایک نئے مزے سے آشنا کیا اسی طرح تاریخ گوئی کے فن کو تکلف اور تصنع سے پاک کر کے سادگی بر جستگی اور لطف زبان سے آراستہ کیا۔ اس کا اعتراف داغ کے شاگرد نواب عزیز جنگ بہادر مصنف غرائب الجمل نے بڑے عجیب انداز میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں ”ہمارے استاد مغفور نواب فصیح الملک داغ دہلوی اگرچہ فن جمل میں بڑے پایہ کے شخص نہ تھے اور وہ خود ہماری ہر ایک تاریخ اصلاح کے وقت فرمایا کرتے تھے لیکن سبحان اللہ زبان کے متعلق آپ کی اصلاح کا کیا کہنا۔ آپ نے ہمارے بعض ان مادہ ہائے تاریخ کو کاٹ کر پھینک دیا۔ جن کی ترکیب میں مبتدا سے خیر دور پڑی ہوئی تھی اور ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ حسن کلام یہ ہے کہ مبتدا سے خیر بہت قریب ہو۔ ہمارے بعض تاریخی مادوں کی ترکیب آپ نے پلٹ دی اور ان کی رونق دو بالا فردادی اور تعقید الفاظ کے آپ ہمیشہ مخالف رہا کرتے تھے۔ آپ کی تاکید تھی کہ با محاورہ الفاظ کا لحاظ رکھا جائے۔ اس لیے کہ خوبی زبان کا درجہ سب پر مقدم ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ عمدہ مضامین نقصان زبان کی وجہ سے خاک میں مل جاتے ہیں۔ اور کم درجہ کا مضمون بھی خوبی زبان کے ساتھ چمک اٹھتا ہے۔ آپ ہی کا

داع کی شخصیت اور سیرت

انیسویں صدی کے اوائل میں دہلی میں ایک صاحب تھے۔ محمد یوسف سادہ کار کشمیری ان کی دو صاحبزادیاں تھیں۔ عمدہ بیگم اور وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ دونوں تین بہنیں تھیں۔ سب سے بڑی بہن بڑی بیگم تھیں۔ اگر بڑی بیگم نام سے کوئی خاتون تھیں تو ہیں اُن کے حالات کا قطعی علم نہیں۔

چوں کہ عمدہ بیگم اور چھوٹی بیگم حسن و جمال کا پیکر تھیں۔ اس لیے دونوں کا تعلق اپنے عہد کی اہم ترین شخصیتوں سے رہا۔

رام پور کے نواب محمد یوسف علی خاں ناظم کا تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں کچھ عرصے دہلی میں قیام رہا تھا۔ دہلی میں اُنھوں نے مرزا غالب سے فارسی اور مولانا فضل حق قرآنی اور مفتی صدر الدین آزاد سے عربی اور دیگر علوم کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی زمانے میں عمدہ خانم کا نواب صاحب سے وہ تعلق پیدا ہوا جو زندگی بھر قائم رہا۔

چھوٹی بیگم پر نواب شمس الدین احمد ایسے فریفتہ ہوئے کہ اُنھیں اپنے ساتھ فیروز پور لے گئے۔

قول تھا کہ ”اگر کسی مادہ میں زبان کی خوبی ہو اور صاحب واقعہ کا نام نہ آسکے تو ایسا مادہ اس مادہ پر فائق ہوگا جس میں صاحب واقعہ کا نام تو ہو مگر زبان کا لحاظ نہ کیا گیا ہو۔“ (غرائب الجمل)
 اساتذہ فن نے اچھی تاریخ کا جو معیار مقرر کیا ہے اسے مختصر طور پر یوں کہا جاسکتا ہے۔
 کہ تاریخ واقعہ کے مناسب ہو۔ برجستہ ہو۔ اس میں بھرتی کے الفاظ نہ ہوں۔ پورے مصرع سے تاریخ حاصل ہو۔ اگر تعلیم یا تخریج ناگزیر ہو تو تعلیم اور تخریج کے الفاظ لطیف کنائے کے ساتھ نظم ہوں۔ فارسی اور اردو کی وہی تاریخیں مشہور ہوئیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ یہ فن تاریخ گوئی کی مہارت کے ساتھ فن شعر کا ریاض بھی چاہتا ہے جہاں یہ دونوں خصوصیتیں جمع ہو گئی ہیں تاریخ چمک اٹھی ہے۔

حضرت داغ دہلوی کا یہ امتیازی وصف ہے کہ ان کی تاریخیں باستثنائے چند پورے مصرع سے برآمد ہوتی ہیں۔ قطعہ کے اشعار داغ کی زبان اور داغ کے رنگ شاعری کے آئینہ دار ہیں۔ داغ نے کچھ تاریخیں فارسی میں بھی کہی ہیں۔ لیکن ان کی بیشتر تاریخیں اردو میں ہیں اور اس اردو میں جس کے لیے داغ کا کہنا تھا کہ ”اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ۔“
 داغ کی غزلوں کی طرح تاریخی قطعات میں بھی اُن کا ٹھیکہ اردو پن بڑے سنہری اور نکھرے ہوئے انداز میں پایا جاتا ہے۔

داغ کی تاریخ کے موضوعات کا تنوع اس بات کا شاہد ہے کہ داغ کو اس فن سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ البتہ انہوں نے اس فن کو مقبول عام بنانے کے لیے اسے پر تکلف صنعتوں اور فنِ حمل کے پرتیبج قواعد کے گورکھ دھندے سے بچا کر اسے صاف دلنشیں اور شعری محاسن سے آراستہ کر کے پیش کیا ہے۔

ان کے سارے تاریخی سرمائے میں صرف دو جگہ صنعت کا استعمال ہوا ہے ایک فارسی تاریخِ نجومِ زما محمد سلطان فتح الملک فخر الدین دلی عہد بہادر کی تاریخِ رحلت ہے۔ جس میں صنعت ضرب سے کام لیا ہے۔ ”بکشید آہِ حسرت دو صد دوازده بار“ اس میں آہ کے ۶ عدد کو ۲۱۲ سے ضرب دے کر ۱۲۷۲ حاصل ہوتا ہے۔

دوسری تاریخِ نواب کلب علی خاں کے جشن کی تاریخ ہے۔ اس میں صنعتِ ترصیع



**THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM**

**LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.**

کو نہایت بے تکلفی سے برتا گیا ہے۔ تاریخ کی اصطلاح میں صنعت ترصیع یہ ہے کہ قطعہ تاریخ کے ہر مصرع سے ایک سن برآمد ہو۔ داغ نے گیارہ اشعار کے اس قطعے کے ہر مصرع سے ۱۲۸۲ھ حاصل کیا ہے۔ اس قطعہ کے صرف دو شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

۱۲۸۲ بھر کر شراب صاف پلا آج جام میں

۱۲۸۲ ساقی ہے انجن کی زباں پر ترانہ آج

۱۲۸۲ سارا ہے جلوہ کلب علی خاں کے دم سے آج

۱۲۸۲ عہد سردور آج ہے جشن شہانہ آج

ایک فارسی تاریخ اور ایک اردو تاریخ میں تعمیر کی مدد سے سن پورا کیا گیا ہے اور تعمیر بھی صرف ایک عدد کا ہے۔

امیر مینائی کی رحلت پر داغ نے ۳ تاریخی قطعے کہے ہیں۔ پہلا قطعہ طویل ہے جس کا تاریخی شعر یہ ہے۔

ہے دعا بھی داغ کی تاریخ بھی
قصر عالی پائے جنت میں امیر

۱۳۱۸ھ

دوسرا قطعہ بھی بہت مشہور ہوا ہے۔

کر گئے رحلت امیر احمد امیر
اب نشاطِ زندگی جاتا رہا
مل گئی تاریخ دل سے داغ کے
آہ لطف شاعری جاتا رہا

۱۳۱۸ = ۱ + ۱۳۱۷

اس تاریخ میں مادہ تاریخ سے ۱۳۱۷ نکلتے ہیں۔ داغ کا دل کنایہ ہے الف کے لیے اس کا ایک عدد شامل کر کے ۱۳۱۸۔

تعمیر کی ایک مثال شیر کے شکار کی تاریخ میں بھی ملتی ہے۔

لکھا سر آغاز سے یہ داغ نے سال بالفضل جہاں دار نے مارے دوشیر

۱۳۰۸ + ۱ = ۱۳۰۹

داغ کی بے تکلف اور برجستہ تاریخیں بے شمار ہیں۔ چند تاریخیں نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔

نظام الملک آصف جاہ نواب میر محبوب علی خاں کی تیسویں سالگرہ پر جو قطعہ تاریخ پیش کیا تھا اس کے ہم شعر درج کیے جاتے ہیں۔

یہ چاند زریعہ الثانی کا یہ پیر کا دن تاریخ چھٹی
ہے فضل خدا تیسویں ہے اب اے شہ ذی شاں سالگرہ
یہ جشن سجا یہ دھوم مچی عالم کو ملا ہے گنج گہر
ہے عقدہ کشائے بخت جہاں دربار زرافشاں سالگرہ
ہر وقت خوشی ہر آن خوشی ہر لحظہ خوشی ہر لمحہ خوشی
ہے عیش کا سماں جشن طرب ہے جشن کا سماں سالگرہ
اے داغ دعا سلطان کو دے تاریخ لکھ اس تقریب کی
جاوید ہمایوں بے حد ہو محبوب علی خاں سالگرہ

۷

تاریخ دیگر سالگرہ نظام

ہزار دانہ یا قوت کی بنے تسبیح
بڑھے کلا وہ میں ہر سال ایک لال گرہ
لکھا ہے داغ نے یہ اس کا مصرع تاریخ
ہزاروں سال مبارک یہ جشن سالگرہ

۸

۱۳۰۶

برس دن میں کہا دیوان ایسا میرے آقائے
 سخن ہے نام اس کا طبع نیکو اس کو کہتے ہیں
 کہی ہیں داغ نے اک بیت میں دوا کی تاریخیں
 یہ ہے وہ بیت در شک بیت ابرو اس کو کہتے ہیں
 یہ ازل مصرع تاریخ ہے تالیف دیوان کا
 نہ ہے معجز بیانی عطر اردو اس کو کہتے ہیں

۱۲۹۲

جو پوچھے کوئی سال طبع پڑھ دوں مصرع ثانی
 چھاپا مطبع میں اچھا نقش جادو اس کو کہتے ہیں ۱۷

۱۲۹۳

تاریخ خلعت سر آسماں جاہ بہادر

ملا آج نواب کو خاص خلعت
 ہوئی دھوم سی دھوم ماہی سے تاماہ
 کہی داغ نے خوب تاریخ اس کی
 وزیر شہنشاہ سر آسماں جاہ ۱۷

۱۳۰۵

یہی برجستگی آسماں جاہ کے بیٹے کی تاریخ ولادت میں ہے۔ قطعہ کا پہلا اور آخری شعر پیش کیا جاتا ہے۔

دیا آسماں جاہ کو حق نے بیٹا
 یہ عالی نسب فخر ہے خاندان کا
 جب اے داغ ہاتھ سے تاریخ پوچھی
 ندا آئی ”خورشید ہے آسماں کا“ ۱۷

۱۳۰۸

داغ نے شاہزادے کی تاریخ ولادت بہت دلچسپ کہی ہے۔ دو شعر کے قطعے میں تین تاریخیں نظم کر دی ہیں۔ تینوں تاریخیں بے ساختہ اور پر لطف ہیں۔

شاہزادے کی ولادت کا ہمایوں سال ہے

یا ”فرغ دیدہ“ لکھوں یا ”چراغِ دُودماں“

۱۳۰۹ھ

۱۳۰۹ھ

مجھ سے ہاتھ نے کہا اے داغ یہ تاریخ لکھ

چاند سا بیٹا مبارک اے شہ کیوں مکاں لے

۱۳۰۹ھ

کلیاتِ منیر کی دو تاریخیں کہی ہیں ایک فارسی میں دوسری اردو میں۔ اردو کی تاریخ کی برجستگی ملاحظہ ہو۔

ہو گئی نظم و نشر عالم گیر

جب یہ دیوان ہو چکے مطبوع

آفتاب منیر و بدر منیر لے

داغ نے اس کی یہ کہی تاریخ

۱۲۹۶ ہجری

شاہزادہ رحیم الدین حیا کے دیوان کی تاریخ فارسی میں بھی کہی ہے اردو میں بھی۔
شاہد شوخی بیان حیا مادہ تاریخ ہے جس سے ۱۳۰۸ھ نکلتا ہے۔

۱۳۰۸ھ

اردو کی تاریخ تاریخ طباعت بھی ہے اور مرزا رحیم الدین حیا کے کلام پر تبصرہ بھی ہے۔

سخن کی قدر یہ ہے قدر کی بنیاد ہے

خوشا توجہ نواب قدرداں محمود

کلام کیا ہے کہ معشوق دلمر بایہ ہے

کیا ہے جمع کلام حیا بسعی بلیغ

کسی نے آنکھ سے دیکھا ہے دیکھنا یہ ہے

کلام صاف پھر اس طبع کا فیض و بلیغ

سخن طرازی تہزادہ حیا یہ ہے

کہا ہے داغ نے سن لویہ مصرع تاریخ

۱۳۰۸

بارگاہِ سلطانی سے گھڑی کا عطیہ ملنے پر داغ نے ایک طویل قطعہ کہہ کر آخری شعر میں

یہ تاریخ کہی۔

لکھو اس گھڑی داغِ تاریخِ زیبا
مرقعِ منورِ گھڑی شاہ نے دی

۱۳۱۱

جب سونے کا توڑا عطا ہوا تو داغ نے فی البدیہہ تاریخ کہی جو بہت سادہ اور بر محل ہے۔

عطیاتِ پیہم کا کیا شکر ہو
کہ فدوی کو کیا عنایت ہو
بدیہ کہو داغِ تاریخ تم
یہ سونے کا توڑا عنایت ہو

۱۳۱۲

امیر مینائی کے دیوانِ صنم خانہٴ عشق کی جو تاریخِ داغ نے کہی ہے اس میں تاریخ کے ساتھ
امیر مینائی کی شاعری کو داغ نے جس طرح خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔

واہ کیا دیوان چمپا ہے لاجواب	اب اسے انتہا تک بے نظیر
شوخیِ الفاظ ہے یا برقِ شوخ	بارشِ مضمون ہے یا ابرِ مطیر
لفظِ مصرع۔ بیت سب جادو بھرے	دلِ فریب و دستان و دلِ پزیر
ہر کمیلہ شاعر دل میں چھ گیا	اس سے بڑھ کر کوئی کیا مارے گا تیر
یہ سخن ہے لائقِ بزمِ سخن	یہ فن ہے قابلِ شاہ و وزیر
مستند کیوں کر نہ ہو ایسا کلام	جو کہا گویا ہے پتھر کی لکیر
آج ہے یہ طوطیِ معجزِ بیاں	بلبلِ ہندوستان کا ہم صفیر
ایسا استاد زمانہ بچہ کہاں	زندہ رکھ اس کو تو یارتِ قدیر

بے یہی اے داغ اس کا سال طبع
کہہ دے تو زیبا خیالاتِ امیر

۱۳۱۳

خصوصیات کلامِ داغ زبان و محاورہ

دلی کی لسانی تاریخ کا یہ پہلو بڑا تابناک ہے کہ اس نے روزمرہ اور عوام کی گفتگو کو استناد کا درجہ بخشا۔ تاریخ نے اپنی اصول پرستی کے تحت زبان کو جن استواری پابندیوں میں جکڑ دیا تھا اس کی وجہ سے وہ عام بول چال کی زبان سے دور اور لطف و شیرینی سے محروم ہو گئی تھی۔ اس کے برعکس متاخرین دہلی نے باستان کے چند اپنی ضابطہ پسندی اور سخی اصلاح و آراستگی کے باوصف زبان کے فطری لوح اور لپک کا لحاظ رکھا۔ اس میں سلاست، روانی اور گھلاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ شعراء نے دہلی نے ہمیشہ سادگی اور صفائی پر بہت زور دیا ہے۔ انھوں نے ہندی الفاظ کو اس قدر بر محل استعمال کیا ہے کہ بول چال کے بے شمار الفاظ محاورات جو ادب میں حقیقہ بے وقعت سمجھے جاتے تھے جزو زبان بن کر بے تکلف استعمال ہونے لگے۔ اس طرح ادب میں بڑی وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو گئی۔ سی۔ ایف۔ اینڈریوز لکھتا ہے۔

”انیسویں صدی کی ابتدا میں ایک عظیم الشان انقلاب ظہور میں آیا۔“

اردو زبان اور طرز تحریر نے جو دونوں فارسی سے زیادہ مشابہ تھیں اپنی زندگی جداگانہ طور پر بسر کرنی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ اس قسم کا لٹریچر پیدا ہو گیا جو تدریج فارسی اسلوب سے ہٹتا چلا گیا اور ہندوستانی کے ماحول سے ہم آہنگ ہو گیا۔ ادبی دنیا میں مغل شہنشاہ کا دربار اس انقلاب کا مرکز بن گیا اور جیسے جیسے انیسویں صدی بڑھتی گئی یہ سارے شمالی ہند کی تاریخ پر اثر ڈالنے والا ثابت ہوا۔“ ۱

اس عہد کا ماحول زبان کے سانچے پر کس حد تک توجہ دیتا تھا اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس وقت با محاورہ زبان میں گفتگو اور روزمرہ آمیز سخن پر دازی داخل اُترہ شرافت تھی۔

”د شریف زادوں ہی میں نہیں عام باشندوں تک میں یہ ذوقِ زبان سرایت کر گیا تھا۔ وہ بھی لطفِ کلام کے عاشق تھے اور نہایت ہی پر لطف زبان بولتے تھے۔“ ۲

اس سلسلے کی ایک اہم کڑی یہ بھی ہے کہ قلعے اور شہر کی زبان میں رشتہ اتصال قائم ہوا۔ قلعے کی زبان دانی اور زبان سازی کے سلسلے میں مولوی سید احمد کا بیان ہے۔ ”روز بروز نئے نئے محاورے“ اصطلاحیں ایجاد و اختراع ہوتی تھیں۔ زبان کا کا ایک ایک لفظ خراجِ چڑھتا تھا۔ تراش خراش پا کر کسائی بنتا تھا۔ سینکڑوں اور ہزاروں محاورے ہیں جنہوں نے شہر میں آکر اہل شہر کی زبان کو دلچسپ اور دلاویز بنا دیا تھا۔ جو محاورے قلعہ معلیٰ سے شہر میں پھیلے تھے ان کی وجہ سے اہل شہر کو اپنی زبان پر فخر ہوتا تھا۔“ ۳

۱۔ حیاتِ ذکا اللہ۔ ص ۶۰۔ سی۔ ایف۔ اینڈریوز، اور ترجمہ ضیاء الدین احمد۔

۲۔ مرقع زبان و بیان دہلی مولوی سید احمد دہلوی۔

۳۔ مرقع زبان و بیان دہلی۔

حقیقت یہ ہے کہ ادب اور شاعری کو مختلف طبقاتِ انام سے قریب تر لانے کے لیے زبان کو سادہ اور سرلیح الفہم بنانا ضروری ہے۔ ایسی صورت میں اظہارِ خیال اور ادائے مطلب میں پیچیدگی سے بچنے کے لیے بول چال کی زبان روزمرہ اور محاورے کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ روزمرہ اور محاورہ بندی کا نام شاعری نہیں لیکن جو شاعری صرف ایک محدود و مخصوص طبقے کے لیے نہ ہو اس میں روزمرہ اور محاورے کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

محاورات وہ ننھے مرقعے ہیں جو کسی سماج کے تجربات، تصورات اور تاثرات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عوام کے لیے ان میں وہی مجاز و مبالغہ، تشبیہ و تمثیل، مصوری و محاکات اور رمزیت و اشاریت ہوتی ہے جو تربیت یافتہ ذہنوں کے لیے حسین استعاروں، لطیف تشبیہوں اور معنی خیز ترکیب و الفاظ میں نظر آتی ہے۔ زبان کی خوبی اس کی سلاست، عام فہمی، نرمی، موزونیت، چھوٹے چھوٹے الفاظ اور بڑے بڑے مطالب پر موقوف ہے۔ عام لوگوں کی زبان کو پایہ اعتبار سے گراناز زبان کے زوال اور عدم مقبولیت کا سبب بنتا ہے۔

دآغ کے یہاں مجموعی حیثیت سے وہ زبان اور لب و لہجہ ملتا ہے جو بنیادی طور پر اردو بولنے والوں کی قدرتی زبان اور لب و لہجہ ہونا چاہئے۔ دآغ کے اکثر اشعار اور مصرعے ایسے ہیں جن میں بول چال کی زبان یا لکل اُسی ترکیب اور ترتیب الفاظ کے ساتھ ملتی ہے جیسا کہ ہم بولتے ہیں یا اُس زمانے کی دہلی میں لوگ بولتے تھے۔ ان کے بہت سے مصرعے اور شعر تو ضربِ امثال بن گئے ہیں اور انہیں پڑھتے ہوئے یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ وزن اور شعر کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

جب جوانی کا مزا جاتا رہا

زندگانی کا مزا جاتا رہا

کوئی نام و نشان پوچھے تو اسے قاصد بتا دینا
تخلص دآغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

نواب شمس الدین احمد خاں سے چھوٹی بیگم کے ہاں ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کا نام ابراہیم رکھا گیا۔ جب یہ لڑکا بڑا ہوا تو دوستوں یا رشتہ داروں یا خود ابراہیم نے اپنا نام ابراہیم سے بدل کر نواب مرزا خاں رکھ لیا۔ ممکن ہے مرزا خاں رکھا ہو اور نواب خاندان کی رعایت سے لکھتے ہوں۔ شاعری کی دنیا میں یہ لڑکا بمبلی ہندوستان، جہاں استاد و سیر الدولہ، ناظم یار جنگ نواب فصیح الملک مرزا خاں داغ دہلوی کے نام اور خطاب سے جانا جاتا ہے۔

داغ، چاندنی چوک دہلی کے جس کوچے میں پیدا ہوئے تھے، اب اُس کا نام کوچہ استاد داغ ہے۔

دہلی کے ریڈیڈنٹ ولیم فریئر اور نواب شمس الدین خاں میں شدید اختلاف ہو گیا بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ نواب شمس الدین احمد خاں کی ایک بہن تھیں، جن کا نام تھا جہانگیر۔ کسی طرح فریئر کی اُن پر نظر پڑ گئی اور وہ اس خاتون کا دیوانہ ہو گیا۔ اُس نے نواب شمس الدین خاں سے اُن کا ذکر اس انداز میں کیا کہ اُن کا خون کھول گیا اور انھوں نے کریم خاں نامی اپنے ایک ملازم سے اُسے قتل کرا دیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ نواب شمس الدین خاں کے والد نواب احمد بخش خاں نے اپنی زندگی میں تمام جائیداد اولاد میں تقسیم کر دی تھی، اُن کی وفات پر نواب شمس الدین خاں ہر چیز پر قابض ہو گئے۔ فریئر نواب احمد بخش خاں کے دوست تھے۔ سرکاری طور پر انھوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ فریئر اور چھوٹی بیگم کا تعلق تھا۔ جو نواب شمس الدین سے برداشت نہ ہو سکا۔ وجہ کچھ بھی ہو۔ نواب صاحب کے ملازم کریم خان نے فریئر کو قتل کیا اور الزام نواب صاحب پر آیا۔

نواب صاحب پر سرسری مقدمہ چلا اور ۳۱ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو انھیں پھانسی دے دی گئی۔ اس وقت داغ کی عمر تقریباً چار سال اور چار مہینے تھی۔ نواب صاحب کی وفات سے چھوٹی بیگم اچانک بے سہارا ہو گئیں۔ چون کہ نواب صاحب نے اُن سے باقاعدہ شادی نہیں کی تھی۔ اس لیے وہ ورثے کے لیے دعویٰ بھی نہیں کر سکیں۔

یہ کیا کہا کہ داغ کو پہچانتے نہیں
 وہ ایک ہی تو شخص ہے تم جانتے نہیں
 مجھے تم جانتے ہو داغ میں ہوں
 کہیں جاتا ہے خالی وار میرا
 بات کرنی بھی نہ آتی تھی تمہیں
 یہ ہمارے سامنے کی بات ہے
 داغ کی شکل دیکھ کر بولے
 ایسی صورت کو پیار کون کرے
 کیا ملا ہم کو زندگی کے سوا
 وہ بھی دشوار، ناتمام، خراب
 دل گیا تم نے لیا ہم کیا کریں
 جانے والی چیز کا غم کیا کریں
 جب یہ سنا کہ داغ کا آزار کم ہوا
 زانو پہ ہاتھ مار کے بولے ستم ہوا
 زندگی اور اس زمانے کی
 ایسے جینے کا کچھ مزا بھی ہے
 آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں
 آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا
 ہم نے اس کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا
 پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا
 خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
 جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
 جو گذرتے ہیں داغ پر صدے
 آپ بندہ نواز کیا جاناں

انہیں نصرت ہوئی سارے جہاں سے
 نئی دنیا کوئی لائے کہاں سے
 داغ کہتے ہیں جنہیں دیکھے وہ بیٹھے ہیں
 آپ کی جان سے دور آپ پہ مرنے والے
 کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
 جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں

داغ کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ الفاظ کی ترتیب اور نشست ایسی ہوتی ہے کہ اکثر و بیشتر اُس کی نشر نہیں کی جاسکتی۔ کہنے اور سننے میں تو یہ بات شاید زیادہ مشکل معلوم نہ ہو مگر اسے برتنے میں جو بہت خواں طے کرنے ہوتے ہیں ان کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے۔ داغ کی شاعری میں داخلی عناصر کی شمولیت، لب و لہجہ کی نرمی و نغمی، شوخی اور رنگارنگی، سوز و ساز، ایک ہلکی پھلکی کیفیت اور محاورات اور روزمرہ کا حسن استعمال ایسی چند خوبیاں ہیں جو انہیں اردو کے دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہیں اور ان کی مقبولیت عامہ کا سبب بنی ہوئی ہیں۔ داغ نے اردو شاعری کو ایک مخصوص رنگ و آہنگ دیا جس میں سوز و ساز کی دھیمی کیفیت، ارضیت و نشاط کی طرف ایک میلان، داخلی خارجیت کے ساتھ لطف زبان کی طرف رغبت اور خلوص جذبات پر چھا جانے والی شوخی تحریر، الفاظ کی مہینیت، طرز بیان کی قوت اور زبان کی قدرت و قیمت کا احساس بیک وقت موجود ہے۔ داغ کی طبع رنگینی، شوخی مزاج، لب و لہجہ کا تیکھا پن اور گرمی گفتار دبستان شاعری میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے جس کی نظیر نہ داغ سے پہلے کہیں دکھائی دیتی ہے اور نہ داغ کے بعد اسے کوئی اُن کی طرح اپنا سکا۔ اردو محاوروں کو پھیلانے، اُن کی نوک پلک درست کرنے اور زبان و شعر میں ان کے حسن استعمال کو رواج دینے میں داغ نے بہت نمایاں حصہ لیا۔ اسی نسبت سے ان کی شاعری اُن لوگوں کے درمیان مقبول ہوئی جو لطف زبان کے عاشق تھے۔ دلی والے اپنے روزمرہ اور محاورے پر کس قدر ناز کیا کرتے تھے اور فارسی لغات و تراکیب پر

اسے کس حد تک ترجیح دیتے تھے اس کا اندازہ دہلی کی پوری لسانی تاریخ کے مطالعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ سعد اللہ گلشن کے اُن مشوروں سے جو انھوں نے دہلی کو دیے تھے۔ دہلی کے ادبی مذاق اور لسانی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ شاہ حاتم نے اپنے منتخب دیوان کے مقدمے میں جو کچھ کہا ہے اُس سے بھی اس امر کا تعین ہو جاتا ہے کہ زبان و بیان کے بارے میں دہلی کا نقطہ نظر کیا رہا ہے۔ معانی کے مقابلے میں الفاظ کے املا، ہجاء اور صوتی آہنگ کی اہمیت محاورے اور روزمرہ کی قدر و قیمت، الفاظ کی مقبول اور مردود صورتیں ہی دہلی والوں کے نزدیک توجہ طلب اور ترجیح کا مرکز رہی ہیں۔ اُنہی کو زبان کے صحیح اور فصیح ہونے کا مدار مانا گیا ہے۔ چنانچہ میر کا قمر الدین منت سے یہ کہنا کہ ”سید صاحب اردوئے معلیٰ خاص دہلی کی زبان ہے۔ آپ اس میں تکلیف نہ کیجئے، اپنی فارسی داری کہہ لیا کیجئے۔“ اور اہل لکھنؤ سے اپنا کلام نہ سنانے کی معذرت کے طور پر کہنا کہ ”میرے کلام کے لیے نقطہ محاورہ اہل اردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں“ اسی روایت کے تسلسل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اصلاحِ زبان کا یہ جذبہ دہلی سے لکھنؤ منتقل ہوا۔ اہل لکھنؤ کے لسانی نقطہ نظر سیاق و قیاس پر کچھ خاص حالات کے تحت ایک گونہ شدت پیدا ہو گئی جس کا اظہار ناسخ کی زبان سے شعر میں ہوا ہے لیکن صحتِ زبان اور فصاحتِ بیان کی اہمیت پر زور دینے کے باوصف اسلوب کے معاملے میں اہل لکھنؤ خاصے روادار رہے ہیں۔ اس کے برعکس اہل دہلی کے یہاں زبان کی مرکزیت کا جو خیال متقدمین کے عہد میں پیدا ہوا تھا۔ اسے رفتہ رفتہ ایک ادارے کی حیثیت حاصل ہو گئی اور وہ دہلوی شاعری اور دہلوی نثر کی بنیاد بن گیا۔

در مصحفی ہوں یا انشاء و انیس، ذوق و ظفر ہوں یا داغ ان میں کون ایسا ہے جو دہلوی زبان کی روایت کو ادارے کی حیثیت سے نہ دیکھتا ہو۔ زبان اور اسلوب بیان کی اساسی اہمیت کو ان کی شاعری میں نخست اول کی حیثیت سے دیکھا جاسکتا ہے۔ داغ اس ادارے کا سب سے زیادہ مقبول اور معتبر شاعر ہے جس کے بعد دہلوی شاعر اور اس دبستان سے وابستہ

افراد صرف زبان سے شعر کہتے ہیں۔“ ملہ

حقیقت یہ ہے کہ دہلی کے دبستان شاعری کی روایتی خصوصیات کو دہلی سے وہ تعلق نہیں جو اردو شاعری اور اردو ادب کی ایک دوسری روایت کو ہے یہ روایت زبان کی روایت ہے اور داغ اس روایت کے مستحکم، مہتمم بالشان منفرد، پہلے اور آخری کامیاب شاعر ہیں۔ جن کی تقلید غالب کی نثر نگاری کی مانند امکانی حدود سے خارج ہے۔ داغ کا انداز بیان دلی اور خاص دلی والوں کا انداز بیان ہے وہ لب و لہجے کے اتار چڑھاؤ، محاورات کی تہذیبی اور طلسمی اثر آفرینی اور بولی کھولی کی جادوگری سے خوب واقف ہیں۔ داغ کے طرز بیان میں مجموعی طور پر جو شیرینی، شگفتگی اور گھلاوٹ ہے وہ خاص اُن کی طبیعت کا رنگ ہے۔ لفظ، تجربات، تاثرات اور مشاہدات کے اظہار کا خارجی وسیلہ ہیں۔ ان میں وجدان کو متاثر کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن الفاظ سے حسن کا جادو تب ہی جگایا جاسکتا ہے جب تجربات میں رعنائی اور دلکشی موجود ہو اور مزاج میں جمالیاتی احساس پایا جاتا ہو۔ داغ احساس جمال بھی رکھتے تھے اور وسیع تجربہ بھی۔ ان کا شباب قلعہ معلیٰ کے حسن و عشق کی طلاطم خیزیوں میں انگریزوں سے چکا تھا وہاں کی رومان پرور فضا میں پروان چڑھا تھا اور حبشی آسودگی سے فیضیاب ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ واردات عشق کو کامیابی اور فن کاری سے بیان کر جاتے ہیں۔ وہ محبت کے جذبے اور خارجی شے کے درمیان تخیلی اور جمالیاتی علاقہ قائم کرتے ہیں اور اپنے جذبے کی وضاحت بڑی عمدگی سے کر جاتے ہیں۔ ایسے کہ ہمارے حواس میں آسودگی لطف اور تازگی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

داغ کی شاعری کی ابتداء دہلی میں ہوئی۔ یہیں قلعہ معلیٰ کے توسل سے انھوں نے ذوق کی شاگردی اختیار کی۔ قلعہ کے اندر اور باہر ماں اور خالہ کی وہ زندگی دیکھی جو مختلف تجربات سے مملو تھی۔ جنس کی اہمیت کا بچپن ہی سے شعوری اور غیر شعوری طور

پراثر قبول کیا اور یہ نقش اسنے گہرے ہو گئے کہ آخر دم تک نہ مٹ سکے۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ سارے ہندوستان میں غالب، مومن، ذوق اور ظفر کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔ ان اساتذہ فن نے دہلی کے اس تنزل پذیر اور زوال آمادہ دور میں اپنے ادبی ماحول سے لذتِ خوابِ بحر کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اسی ماحول میں داغ کی شاعری نے ارتقاء کی منزلیں طے کیں۔ اسی لیے ابتدا ہی سے ان کے اندازِ بیان میں ایک غیر معمولی لطف اور کشش پائی جاتی ہے۔ غالب ان کی زبان کی صفائی اور محاورات کی برجستگی کے مدح تھے چنانچہ شار علی شہرت نے غالب سے کی ہوئی گفتگو کا ایک حصہ نقل کیا ہے۔

”فرمانے لگے دہلی والوں کی جو اردو ہے اسی کو ہی اشعار میں لکھنا چاہیے۔

آخر عمر میں ہماری تو یہی رائے قائم ہوئی ہے۔ میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی کہ داغ کی اردو کیسی ہے۔ فرمانے لگے ایسی عمدہ کہ کسی کی کیا ہوگی۔ ذوق نے اردو کو اپنی گود میں پالا تھا۔ داغ اس کو نہ فقط پال رہا ہے بلکہ اس کو تعلیم دے رہا ہے۔“

داغ کی غزل گوئی محض زبان کے بل بوتے پر نہیں تھی۔ ”بندہ سخی، حاضر جوابی اور برجستگی کی صفت کو داغ کی بے پناہ شوخی نے بھڑکتی ہوئی چنگاریاں بنا دیا ہے“ سہ ”داغ کی شاعری کا محرک ہوس پرستی کا جذبہ سہی لیکن یہ جذبہ صحت مند ہے۔ جرات کی طرح محض عیاشی کی آرزو نہیں۔ اسے ہم بقول حسرت موہانی خاسقانہ شاعری کہہ سکتے ہیں جو لطف سے خالی نہیں اور جس میں نشاط اور شوخی کی آمیزش ملتی ہے جسے طرزِ بیان کی چستی نے نکھار دیا ہے۔“ چنانچہ خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں کہ داغ کی تمام تر شاعری جوان شاعر ہے۔ ان کے یہاں بواہو سہی بھی تندرست قسم کی بواہو سہی ہے اور اس میں ایک البیلاپن ہے۔“

سہ بحوالہ آئینہ داغ، ماخوذ از مطالعہ داغ زیدی ص ۳۴۔

سہ اندازہ۔۔۔ فراق ص ۱۸۹ سہ اردو غزل۔ یوسف حسین خاں۔ ص ۱۰۰۔

سہ فکر و فن۔ خلیل الرحمن اعظمی۔ ص ۱۱۶۔

خلیل جبران نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے ”میں اپنی فطری کمزوریوں کو اکتسابی فضیلتوں میں چھپانا پسند نہیں کرتا۔ مجھے اپنی فطری کمزوریاں بہت عزیز ہیں۔ میں انہیں چھوڑنا نہیں چاہتا کیوں کہ وہ میری ذاتی ملکیت ہیں۔“ داغ کے ہاں بھی پاکبازی اور فرشتہ خصلتی کا دعویٰ نہیں ہے۔ ان کا ظاہر و باطن ایک ہے وہ اپنے جنسی میلانات اور جذباتی کیفیات کا یہ کم و کاست ذکر کرتے ہیں۔ وہ عشق کو جنسی اور جسمانی آسودگی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور جسارت سے اسے بیان بھی کر دیتے ہیں۔ داغ پر کچھ لوگوں نے فحش گوئی اور ارباب نشاط کا شاعر ہونے کا الزام لگایا ہے۔ یہ اگلے وقت کے لوگوں کی بات ہے۔ آج فحاشی اور عریانی میں امتیاز کرنے کا سلیقہ آگیا ہے۔ عریانی کو فنون لطیفہ کے موضوع کی حیثیت سے تسلیم بھی کر لیا گیا ہے، البتہ یہ راستہ خطرناک بہت ہے۔ داغ نے اس پل صراط کو بڑی کامیابی سے طے کیا ہے اور اس کامیابی میں ان کی زبان کو بڑا دخل ہے وہ اثاروں، کنایوں اور لب و لہجے کے اتار چڑھاؤ سے کام لے کر فحاشی سے اپنا دامن بچا لیتے ہیں۔

ہزار کام مزے کے ہیں داغ الفت میں
جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں

جو مرے دل میں ہے کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے
گدگدالوں تو کہوں پاؤں دیا لوں تو کہوں

کیوں وصل کی شب ہاتھ لگانے نہیں دیتے
معشوق ہو یا کوئی امانت ہو کسی کی

ہیں تو شوق ہے بے پردہ تم کو دکھیں گے
تعبیں ہے شرم تو آنکھوں پہ ہاتھ دھر لینا

ایک حرف آرزو پہ وہ مجھ سے خفا ہوئے
اتنی سی بات کہہ کے گناہ گار ہو گیا

ہاتھ گردن میں ڈال کر بوئے
کس سے ملے ترے گلے مل کر

وصل کے باب میں کی عرض تو وہ کہنے لگے
کیوں مرے جاتے ہو ہو جائے گا ہو جائے گا

دی شب وصل موزن نے اذال پھلی رات
ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا

وصل کی پھیڑ چھاڑ، اشارے کنائے، معشوق کی عشوہ طرازی اور شوخیاں۔ عاشق کی حاضر جوابی اور بے تابیاں، عہد و پیمائیاں، شکوہ و شکایت، رشک اور بدگمانی، چھین چھپٹ، روٹھنا اور مننا، الجھن اور بے بسی، حسد اور جن و غیرہ مجازی عشق کے لوازمات ہیں اور یہی داغ کی غزل کی جان ہیں۔ داغ نے معاملہ بندی کے ان مضامین کو الفاظ و محاورے کے موزوں استعمال سے ڈرامائی بنا دیا ہے ان کا کمال یہ بھی کہ انھوں نے ان معاملات کے بیان میں سو قیام نہ پن کہیں نہیں آنے دیا۔ بیان کی اس قدرت کا باقاعدہ تجربہ کیا جائے تو یہ واضح ہو گا کہ اس میں بھی داغ کی زبان دانی کو بڑا داخل تھا۔ داغ کی شاعری واقعیت، اصلیت اور داخلیت پر مبنی ہے وہ نئے نئے الفاظ، تاثیر کی نئی صورتوں، حسن ادا، لب و لہجے اور پُر لطف تیکھے پیرایہ بیان سے خیالی تصویروں اور یاروں کی باز آفرینی کرتے ہیں۔

داغ کی شاعری میں جو چو پچال پن ہے وہ زندگی کے نشاطیہ عناصر کو ابھارتا

ہے۔ ”اور اردو غزل میں یاس و نامرادی کی — فردا نی میں ان کے اشعار ایسا نخلستان ہیں جہاں خوش حالی کی دھوپ ہے بے فکری کے چھینٹے اڑتے ہیں۔ لگاؤ کے اشارے ہیں بے تکلفی کی گدگدیاں ہیں۔ ان میں عشق کا گداز یا سوز نہیں ہے۔ گہرے لگاؤ کی سنجیدگی اور مسرت نہیں ہے لیکن زندگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قوس قزح لہرائے اور نکل جائے۔ لکھلکھلاتا ہوا پھول جھکے اور پلک کر سرک جائے،“ سہ

داغ کی غزل گوئی کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کا انفرادی لب و لہجہ ہے۔ ان کے لب و لہجے میں شوخی، تیکھا پن، شگفتگی اور دلکش طرز ہے جو ان کے طرز ادا کو انفرادیت بخشتے ہیں۔ ان کا لب و لہجہ فن کارانہ ہے اس میں ایسی بالیدگی، استواری، رعنائی اور رنگینی ہے کہ داغ کی آواز منفرد طور پر پہچانی جاتی ہے۔ لب و لہجہ منحصر ہے۔ انداز بیان، عشق و اظہار اور طرز ادا پر لفظوں کے رکھ رکھاؤ، فقرہوں کے موڑ، جملوں کے تیور، کلام کی روانی، آہنگ اور زبان کی آئینہ پر داغ کے لب و لہجے میں یہ سارے عناصر پائے جاتے ہیں۔ داغ کی زبان میں جو لطافت، نزاکت، لوح اور روانی ہے اس نے ان کی شاعری میں آہنگ احساس اور آہنگ سماعی کا ایک لطیف رنگ قائم کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری کا بڑا حصہ مترنم ہے۔

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں

ناز والے نیاز کیا جانیں

داغ رنگا رنگ اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ نہایت ذہین اور طبائع تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنا راستہ الگ نکالا اور اس میں اتنی جاذبیت اور کشش پیدا کی کہ اس نے اردو غزل گو شعرا کی کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ داغ نے غزل کو ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کیا۔ داغ کا فن شاعری ایک ادارہ ہے۔ یہ اپنے دور کے سماجی اور ثقافتی تقاضوں کی ترجمانی کرتا ہے اور اس کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔ داغ کی شاعری کا

مشن تھا تمام عمر دہلی کی شستہ ورقہ زبان کی شیرینی، حلاوت اور لوح سے تمام ہندوستان کے کام و دہن کی ضیافت کرنا۔ اس شائستہ زبان کو عوام و خواص میں مقبول بنانا۔ دہلی کے محاورے اور روزمرہ کا عموماً اور اردوئے معلیٰ کا خصوصاً اپنے کلام میں استعمال کر کے انھیں بقائے دوام بخشا۔ انھوں نے اردو زبان کی گراند قدر خدمات انجام دی ہیں۔ چنانچہ فراق گورکھپوری لکھتے ہیں:

”دآغ کی زبان میں قلیتے بھرے ہوئے ہیں جو رہ کر چھوٹے چلے جاتے ہیں
دلی کی بھرپور زندگی دآغ کے کلام میں کچھ اس طرح جلوہ گر ہو گئی ہے کہ دیکھنے
اور سننے والے دیکھتے اور سنتے رہ جاتے ہیں۔ دلی کی بولی ٹھولی اپنی پوری موج زنی
کے ساتھ دآغ کی غزلوں میں لہرا رہی ہے دآغ کے لیے رائے عامہ بالکل سچائی
پر تھی کہ یہ شخص زبان کا لاثانی جادو گر ہے اردو شاعری نے دآغ کے برابر کا
فقرے باز آج تک پیدا نہیں کیا اور نہ آئندہ کر سکے گی۔“

غیروں کا اختراع و تصرف غلط ہے دآغ
اردو ہی وہ نہیں جو ہماری زبان نہیں

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں دآغ
ہندوستان میں موصوم ہماری زبان کی ہے

کتابیات

- ۱- ذوق حیات و انتقاد ڈاکٹر تنویر احمد علوی
- ۲- مقدمہ کلیات شاہ نصیر حصہ اول " " "
- ۳- مطالعہ داغ محمد علی زیدی
- ۴- محاورات داغ احسن مارہروی
- ۵- نگار داغ نمبر ۱۹۵۳ء
- ۶- اندازے
- ۷- فکر و فن خلیل الرحمن اعظمی
- ۸- حیاتِ ذکار اللہ سی۔ ایف اینڈریوز۔ ترجمہ اردو
- ۹- مرقع زبانِ دہلی سید احمد دہلوی
- ۱۰- اردو غزل یوسف حسین خاں
- ۱۱- حرفِ غزل مسیح الزماں
- ۱۲- لال تلے کی ایک جھلک ناصر ندیر فراق
- ۱۳- دوا دین داغ
- ۱۴- دہلی کا دبستانِ شاعری نور الحسن ہاشمی
- ۱۵- فسانہ عجائب کا تنقیدی مطالعہ [دلی سے لکھنؤ تک سید ضمیر حسن

کچھ عرصے بعد نواب شمس الدین خاں کے سوتیلے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر
نیر خشاں کی نظر انتخاب چھوٹی بیگم پر پڑی اور وہ نواب صاحب کے گھر آگئیں۔ کچھ
عرصے ان کے ساتھ رہیں، نواب صاحب سے کوئی اولاد نہیں ہوئی پھر چھوٹی بیگم آغا تراب علی نای
ایک شخص کے ساتھ رہنے لگیں۔ آغا تراب علی سے آغا مرزا شائع پیدا ہوئے۔

۱۸۴۲ء میں چھوٹی بیگم کی عمر تقریباً تیس بیس سال تھی کہ صاحب عالم —
مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر ولی عہد شاہِ دہلی المعروف بہ مرزا فخر دُان پر عاشق ہو گئے۔
محمد حسین آزاد نے دیوانِ ذوق کے دیباچے میں لکھا ہے کہ مرزا فخر دُکے پاس چھوٹی بیگم
کی تصویر تھی۔ انھوں نے یہ تصویر استادِ ذوق کو دکھا کر اپنے محبوب کے حسن کی داد
چاہی تھی۔ استاد سمجھ گئے کہ ولی عہد پر چھوٹی بیگم کا جادو چل گیا ہے۔ بقول محمد حسین آزاد
یہ وہ زمانہ تھا جب مرزا فخر دُ ولی عہد نہیں بنے تھے اور چوبیس پچیس سال کی عمر تھی۔ جبکہ
چھوٹی بیگم عمر میں کافی بڑی تھیں۔ استاد نے مرزا فخر دُ کی حوصلہ شکنی کے لیے چھوٹی بیگم
کے لیے نازیبا باتیں کہیں۔ مگر کچھ اثر نہ ہوا اور کچھ دن بعد یہ خاتون مرزا فخر دُ کی تیسری
بیوی بن کر قلعے میں آگئیں۔ قلعے میں داخل ہوتے ہی اُن کی قسمت بدل گئی۔ بعض حضرات
نے لکھا ہے کہ مرزا فخر دُ نے اُنھیں نواب شوکت محل صاحبہ کے خطاب سے نوازا۔
مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم نے بعض اہم دلائل پیش کر کے کہا ہے ”ولی عہد کی
طرف سے ”شوکت محل“ خطاب پانا محل نظر قرار پاتا ہے۔“ (نگار، لکھنؤ، اپریل ۱۹۹۸ء)
چھوٹی بیگم کے ساتھ داغ بھی لال قلعے میں پہنچ گئے۔

اس وقت داغ کی عمر تقریباً تیرہ سال تھی۔ اگرچہ مغل حکومت
زوال کی آخری منزلوں میں تھی، لیکن لال قلعے میں اب بھی اہل کمال جمع تھے
اور ان کے کمال اور فن کی قدر ہوتی تھی۔ داغ کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا —
غلام حسین شکیبہ کے صاحبزادے مولوی سید احمد حسین سے فارسی اور درسی کتابیں
پڑھیں۔ اس عہد کے مشہور خوش نویس سید امیر پنجہ کش دہلوی سے فن خوش نویسی
پر مہارت حاصل کی۔ اس فن میں مرزا عبید اللہ بیگ شاگرد سید امیر پنجہ کش سے بھی

پروفیسر عتیق احمد صدیقی

مکاتیب داغ

انشائے داغ کے مرتب اور داغ کے عزیز شاگرد احسن مارہروی داغ کی
مکتوب نگاری کے متعلق لکھتے ہیں :

”مرحوم کی یہ عادت تھی کہ اپنے دست و قلم سے بہت کم خط
لکھتے تھے..... عام شاگردوں اور دوستوں کو زیادہ تر کسی حاضر
باش شاگرد سے خط لکھوائے جاتے..... خط بہت لمبے چوڑے نہیں ہوتے
تھے، بلکہ ان میں بہت مختصر اور چپت فقرے قلم بند کیے جاتے تھے.... موسم
سرمایں یہ کام عموماً بعد مغرب شروع ہوتا اور کھانے کے وقت تک کبھی کھانے
کے بعد تک جاری رہتا۔ دوسرے موسموں میں حسب موقع جب طبیعت
بحال ہوتی تو ایسا ہو کر جاتا تھا..... اس عمل درآمد کا سلسلہ برسوں تک جاری
رہا، جس میں روزانہ تقریباً ۱۰-۱۵ جوابوں کا اوسط پڑ جاتا تھا۔“

لیکن جب احسن صاحب نے خطوط داغ کا مجموعہ مرتب کیا (شائع شدہ ۱۹۴۱ء)
تو ان کی کوشش کے باوجود محض ۴۸ خطوط ہم دست ہو سکے۔ مگر رفیق مارہروی نے مزید

جستجو کر کے پندرہ سال بعد (۱۹۵۶ء میں) ۹۹ خطوط کے ساتھ دوسرا مجموعہ ”زبانِ داغ“ کے نام سے شائع کیا۔ اس طرح داغ کے کل خطوط جو ہیتا ہو سکے، ان کی تعداد ۲۳۹ ہو گئی۔ اسی سال (۱۹۵۶ء) امتیاز علی خاں عرشی نے اردو ادب میں ان ۲۱ خطوط کا مجموعہ بھی ضروری اور مفید حواشی کے ساتھ شائع کرایا، جو رضالا سبیری نے خرید لیا تھا۔ دو ایک کو چھوڑ کر باقی سب خطوط ”زبانِ داغ“ میں شامل ہیں۔ گویا اب بھی تعداد مکاتیب میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ احسن کی شہادت کے پیش نظر مکتوباتِ داغ کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوتی چاہیے تھی۔ اس کے مقابلے میں موجودہ تعداد بہت ہی کم ہے گویا مکتوباتِ داغ کی بڑی تعداد دوستوں کی بے اتفاقی اور تلامذہ کی بے توجہی کے باعث ضائع ہو گئی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ضائع ہونے والے خطوط کی تعداد کیلئے۔ احسن صاحب ہی یہ اطلاع بھی فراہم کرتے ہیں کہ:

”راقم نے اپنے زمانہ قیام میں یہ التزام رکھا تھا کہ خطوط کے لیے یادداشت کا ایک رجسٹر بنوایا تھا جس میں خطوط کی روانگی نمبر وار درج کی جاتی تھی۔ یہ دستور بہت دنوں تک جاری رہا اور میں نے اپنے حیدر آباد سے چلے آنے کے بعد بھی ایسے خطوط پائے اور دیکھے جن پر رجسٹر کا نمبر چڑھا ہوا ہوتا تھا۔“

(النشائے داغ ص ۷۷)

اس اطلاع کی بنیاد پر یہ معلوم کرنا آسان تھا کہ داغ نے اندازاً کتنے خط لکھے، جن میں سے احسن صاحب کو صرف ۱۴۰ دستیاب ہو سکے۔ لیکن وہ اس بارے میں خاموشی اختیار کر گئے۔ النشائے داغ میں خود بہت سے وہ خطوط موجود نہیں ہیں جو بعد میں ”زبانِ داغ“ میں شامل کیے گئے۔ آخری خط مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۵۶ء ہے، یعنی داغ کی وفات سے صرف چند ماہ پیشتر۔ اندراج رجسٹر کا نمبر اگر اس پر بھی تھا یا اس سے سابقہ خطوط میں تھا، تو کم از کم تعداد خطوط کا تعین ضرور ہو سکتا تھا۔ بالخصوص ان چار برسوں کے خطوط کا جو احسن کے درود حیدر آباد کے بعد لکھے گئے ہوں گے۔ مگر اس کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ خطوط کا جواب بالالتزام لکھنے کی جو شہادت پیش

کی گئی ہے، وہ لفظاً اور معناً شاید درست نہیں ہے۔

داعغ نے بے فکری اور خوش حالی کے ماحول میں آنکھ کھولی: بچپن اور نوجوانی کا زمانہ حسن و عشق کی رنگ رلیوں میں گزرا۔ وہ قلعہ معلیٰ کی شاہانہ سرپرستیوں میں دارج عیش دیتے رہے اور رام پور کے روح پرور ماحول سے متمتع ہوتے رہے۔ ہر دو جگہ کی سرپرستی کے باعث وہ ۲۵ سال کی عمر تک ہر فکر سے آزاد رہے اور عیش و عشرت کی زندگی گزارتے رہے۔ اس ماحول میں جو مزاج بنا وہ سنجیدگی اور گہرائی سے محروم رہا۔ شوخی، نشاط آفرینی، البیلاپن اور سطحیت ان کی شاعری کی خصوصیات قرار پائیں۔ زبان کا چٹخار اس پر مستزاد مکتوب نگاری کے علاوہ انھوں نے نشر کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ان مرکاتیب میں بھی سب خصوصیات در آئیں۔ احسن مارہروی اپنا مشاہدہ قلم بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”جس طرح وہ شعر کہتے ہیں زیادہ توقف و نامل نہیں کرتے تھے اور عام شعر کی طرح دیر تک سر در گریاں نہیں رہتے تھے، اسی طرح خطوط لکھنے یا لکھوانے میں غور و فکر کے عادی نہ تھے، سوچ سوچ کر ایک ایک جملہ نہیں بولتے تھے بلکہ بے تکلف اور بے ساختہ لکھواتے چلے جاتے تھے۔۔۔۔۔ خطوط لکھنے یا لکھوانے کے لیے کوئی خاص اہتمام نہیں ہوتا تھا اور اس کے لیے خلوت و تنہائی کا انتظار نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ عام جگہ میں جس طرح وہ فکر سخن کیا کرتے تھے، اسی انداز سے خط و کتابت کا بھی سلسلہ جاری رہتا تھا۔“

داعغ (داعغ ص ۹۰)

داعغ جو زبان کے بادشاہ ہیں اور جو بقول حامد حسن قادری ”انتخاب الفاظ“ حسن بندش، لطف محاورہ، صفائی و روانی میں کسی اردو شاعر سے کم نہیں۔ ”وہ کمال داعغ ص ۱۰۱ شاعری کے کوچے سے باہر قدم رکھتے ہیں تو بے مزہ ہو جاتے ہیں۔ یہ عدم توجہی، بے فکری اور عجلت کا نتیجہ تھا کہ اردو کے اس صاحب طرز شاعر اور زبان کے پارکھ، بلکہ محاورہ و روزمرہ کی روایت کے پاسبان کے مرکاتیب میں کوئی ادبی شان پیدا نہ ہو سکی۔ ان میں نہ روزمرہ کی چاشنی نظر آتی ہے نہ محاورات کی برجستگی،

نہ ندرت ادا کی کوئی اور خوبی۔ بلکہ اکثر مقامات پر زبان و بیان کی ناہمواریاں اور اغلاط نظر آتی ہیں۔ اس کی توجیہ احسن مارہروی تو یوں کرتے ہیں :

”.... فی الحقیقت وہ ان کی غلطی نہیں ہوتی تھی، بلکہ کاتب کی غفلت یا غلط سماعت کی وجہ سے ایسا ہو جاتا تھا۔۔۔۔۔ کبھی کبھی کم سواد بھی کاتب بن جاتے تھے اور انہیں کے سبب سے ایسی غلطیاں ہو جاتی تھیں۔“

(انشائے داغ ص ۹)

لیکن اسے ایک عقیدہ مند کی تاویل سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بہت سی ناہمواریوں کو نہ کاتب کی کم سواد کی سر مڑھا جاسکتا ہے، نہ غلط سماعت کے۔ محض غیرو تامل کا فقدان بے توجہی اور عجلت پسندی اس کا سبب قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ یہ بات بھی تعجب خیز ہے کہ داغ جیسا زبان پر نظر رکھنے والا شخص عجلت یا بے توجہی میں ایسے اموں کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ مثلاً اکثر خطوط میں شتر گریگی کا عیب موجود ہے۔ احسن مارہروی کے نام خط میں ان کو ”آپ“ سے مخاطب کیا ہے۔ مگر لکھتے لکھتے ضمیر بدل جاتی ہے۔ لکھتے ہیں :

”اب آپ لکھتے ہیں کہ میرے پاس ایک پیسہ نہیں، کیا یہاں کے قرض کو آپ قرض نہیں سمجھتے۔ افسوس کہ آپ بدنام بھی ہوئے اور اپنا فائدہ بھی چھوڑا کثرتِ آلام سے تمھارے حواس بجا نہیں رہے۔“

(زبان داغ ص ۱۱)

داغ کے ایک اور شاگرد ہیں نواب حسن علی خاں۔ یہ حیدر آباد کے رئیس ہیں۔ داغ سے بہت قربت ہے۔ ان کے راز دار اور ہر وقت کے حاضر باشوں میں ہیں۔ ان کے نام ایک چار سطری خط ملاحظہ ہو :

”نواب صاحب تغافل شعرا کا مل ایک ہفتہ کے بعد آپ کا خط ملا۔

کیفیت معلوم ہوئی۔ آپ کی آستانی کا بھی خط ملا۔ وہ تم سے سخت ناراض ہیں۔

تمھاری یہ حرکت مجھے بھی پسند نہیں آئی۔ جلد جائے اور ان کو راضی کرنے کی

اس طرح کی عبارتوں میں تعقید لفظی سے پیدا ہونے والی بے مزگی کے علاوہ فقرے الگ الگ ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں اور عبارت کی سہواری و روانی کو مجروح کرتے ہیں۔
تعقید لفظی تو ان مکاتیب کی عبارتوں میں بہت عام ہے، جس سے ناہمواری عبارت کا احساس ہوتا ہے۔

”لیکن افسوس حالات اُن کے گھر کے اس کی اجازت نہیں دیتے۔“

(زبان داغ ص ۱۰)

”نہ یہ وقت رہے گا اور نہ آپ کا روپیہ دیا ہوا مجھ پر باقی رہے گا۔“

(زبان داغ ص ۲۱۲)

مکاتیب شبکی کے مقدمہ مہدی افادی نے انشاء پر داری اور شاعری کو دو الگ الگ فطری صلاحیتوں کا اظہار قرار دیتے ہوئے جو بات کہی تھی وہ یہاں بھی صادق آتی ہے:
”اچھے اچھے بولنے والوں، چوٹی کے شاعروں کو دیکھا کہ دو سطریں سیدھی سادی نہیں لکھ سکتے۔“

یہ درست ہے کہ داغ نثر کے آدمی نہیں۔ نثر میں اُنھوں نے خطوط کے علاوہ کچھ اور لکھا بھی نہیں، لیکن اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ داغ جس دور میں رہا ہے ہیں، اس میں نثر بے توجہی کی چیز نہیں رہ گئی ہے۔ خود غالب کے خطوط اطراف ملک میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اس مقبولیت میں اُن کی شوخی بیانی کو بھی دخل ہے اور ان احوال و کوائف کو بھی جن کا ذکر غالب نے ان خطوط میں کیا اور جن کے باعث خطوط غالب کو اپنے دور کی ایک اہم دستاویز کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے نثر نگاری کی جو روایت شروع کی اس کو بھی تقریباً نصف صدی گزر چکی ہے اور نثر کا بڑا سرمایہ جمع ہو چکا ہے۔ موقت الشیوع رسائل کی بدولت اہل ملک کی توجہ نثر نگاری کی طرف برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ اس سے نثر کی معیار بندی لہجی ہو رہی ہے اور نثر نگاری کی روایت کو استحکام بھی حاصل ہو رہا ہے اور قدر و منزلت بھی! حیدر آباد ایک ایسا مرکز بن چکا ہے جو ان تمام تبدیلیوں کو جذب کر رہا ہے اور اس کا

نقطہ عروج جامعہ عثمانیہ کے قیام کی شکل میں نظر آتا ہے مگر جس طرح داغ کی شاعری اس دور کے تمام انقلابات و حوادث سے بیگانہ و شامی رہی اسی طرح مکاتیب داغ پر بھی ان تمام تبدیلیوں کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔

دستیاب خطوط میں داغ کے اولین خط ۱۸۶۷ء میں لکھے گئے اور یہ سلسلہ ۱۹۰۷ء تک جاری رہا۔ اس طرح ان کی مکتوب نگاری کی عمر پینتالیس سال ہو جاتی ہے۔ اس دوران ان کی شاعری برابر تبدیلیوں سے گزرتی رہی۔ زبان و بیان میں برابر صفائی آتی گئی۔ بات کہنے کا طریقہ بہتر ہوتا گیا۔ ہلکے پھلکے نازک خیالات کے اظہار کی شگفتگی و شادابی میں اضافہ ہوتا رہا۔ استناد زبان کے دعوے کے ساتھ محاورہ بندی کا جادو بھی جاگتا رہا۔ یہ ارتقائی صورت اس امر کی رہنمائی ہے کہ شاعری پر پوری توجہ مرکوز تھی۔ نثر کو وہ توجہ نہیں ملی اور اس لیے اس میں نسبتاً ایک ٹھہراؤ کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ داغ نے نثر کو اور مکتوب نگاری کو فن کی طرح نہیں برتا۔ نہ اس میں خراش تراش کی کوشش کی نہ بنانے سنوارنے کی۔ نہ اپنے اشعار کی طرح ان کے اشتہار کو ضروری سمجھا بلکہ ان تحریروں کو خالص نجی معاملہ کی طرح رکھا جو اکثر و بیشتر راز سر بستہ ہوتے ہیں اور چند متعلقہ افراد کے علاوہ ان میں کوئی شریک نہیں ہوتا۔ اور ان متعلقہ افراد سے کوئی بات چھپائی بھی نہیں جاتی۔ اچھی، بری، تلخ و شیریں، ادنیٰ و اعلیٰ غرض سبھی واردات قلبیہ کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ داغ کے یہ خطوط بھی اسی قبیل کی چیز نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ان خطوط کے ذریعہ اپنی کمزوریوں پر کوئی پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی نہ مصنوعی نقاب اوڑھے نہ اپنی ذات کے گرد کوئی ہالہ بنایا، نہ ذاتی کوالف کو آفاقی رشتوں میں منسلک کیا۔ بلکہ صرف حسب ضرورت خط لکھے جن میں یا تو معاملات کا مختصر اور صاف بیان ہے، یا دل پر گزرنے والی — واردات کا ذکر۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ خطوط ان کے سچے انسانی جذبات کے آئینہ دار ہیں۔ یہیں سے ایک اور قیاس کو تقویت ملتی ہے، ان کے عقیدتمندوں کا یہ خیال کہ انھوں نے کہیں زیادہ خطوط لکھے جو محفوظ نہ رہ سکے، محض خوش فہمی پر مبنی ہو سکتا ہے۔ انھوں نے ضرورتاً خط لکھے اور اتنا ہی لکھا جتنی ضرورت

تھی۔ اصلاح شعر کی بات جداگانہ ہے کہ اول تو یہ خطوط کے زمرے میں نہیں آتی۔ دوسرے ان میں شاذ ہی کہیں تشریح و توضیح ہے۔ چوں کہ ان کے تلامذہ کی تعداد کثیر تھی اور وہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ شاگرد بغیر اصلاح کے اشعار و غزلیات شائع کرائیں۔ جن بارہوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”آج وہ غزلیں بھی شاگردوں کی دیکھیں جن کی نقل آپ نے بھجوائی تھی اب تو ہر شخص بجائے خود استاد ہے۔ بجز ایک دو شخصوں کے اور سب غزلیں بے اصلاحی ہیں۔ آج میں نے دیکھ کر ان کو بھی بنادیا اس خط میں ملفوف کر کے بھیجتا ہوں۔ بارق اور برق کی غزل تو میں نے دیکھی تھی اور صاحبوں کو کارڈ لکھ کر اطلاع دے دیجئے کہ استاد اس بات سے ناراض ہوئے۔ ایک اشتہار اس گلدستے میں آپ چھاپ دیجئے اکثر استاد کے شاگرد بجائے خود استاد بن کر اپنی غزلیں بے اصلاحی چھپوا دیتے ہیں، اس میں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔۔۔۔۔ اسی مضمون کی نقل گلدستہ ارغماں میں بھیج دینا کہ وہاں بھی چھاپ دیں۔ اہل انتخاب کا یہ فرض منصبی ہے کہ غلط کلام کو نہ چھاپیں۔“

دربار داغ ص ۵۰

اس لیے اصلاحی مراسلت کا سلسلہ یقیناً طویل ہوگا، لیکن اسے مکتوب نگاری سے حیدر رکھنا پڑے گا۔

داغ جن درباروں سے وابستہ رہے ان سے مراسلت کا بہت کم موقعہ آیا۔ والئی رام پور نواب کلب علی خاں کے نام سب سے زیادہ خطوط ملتے ہیں۔ ان کی تعداد ۱۳ ہے۔ لیکن یہ سب خطوط صرف رسمی امور پر مبنی ہیں۔ ان میں انداز بیان بھی بہت سپاٹ اور بے مزہ ہے۔ القاب و آداب میں بھی ایک گونہ پابندی رکھی گئی ہے۔ تقریباً یہ سب خط ”غریب پرور فیض گستر سلامت“ سے شروع ہو کر ”واجب بود عرض نمود۔ الہی آفتاب دولت و اقبال تاباں باد۔“ عرضی فدوی نواب مرزا خاں داغ۔“ پر ختم ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک دو کو چھوڑ کر باقی خطوط خزانہ فیض منصبی کی بجا آوری سے متعلق ہیں یعنی یا تو

خریداری اشیاء یا ریاست کی طرف سے بعض مقامات مقدسہ کی تعمیر و مرمت سے متعلق امور کا ذکر ان میں کیا گیا ہے۔ خط سے زیادہ انہیں درخواستیں یا دفتری یادداشتیں کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ان میں کوئی ادبی چاشنی نظر نہیں آتی نہ خیال کے اعتبار سے، نہ زبان و بیان کے اعتبار سے ان میں امور واقعی کا بے کم و کاست بیان ہے۔ البتہ ریاست اور نواب صاحب سے تعلق خاطر کی جھلک ان میں نظر آتی ہے۔ نواب صاحب کی خیر خواہی کا جذبہ ہر جگہ جھلک رہا ہے۔ ان کے لیے نادر اشیاء کی تلاش رہتی ہے۔ زیارات و مقامات مقدسہ کی مرمت وغیرہ ان کی طرف سے کرائی جاتی ہے، وہاں ان کی صحت اور اقبالندی کے لیے دعائیں کرائی جاتی ہیں، عوام الناس میں نواب والا نشان کی مقبولیت کے ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں۔ ایک دلچسپ انکشاف یہ بھی ہوتا ہے کہ کس طرح دہلی کی تحریک ان ریاستوں کی تعمیر کی بنیاد فراہم کر رہی ہے۔ نواب یوسف علی خاں کو شاہیہ کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

”یہاں (دہلی میں) ہزار ہا مکانات منہدم ہوئے۔ اگر حضور ارشاد فرمائیں تو سنگ مرمر اور سنگ باسی کے ستون بہ کفایت ہاتھ لگ سکتے ہیں اور چو کے سنگ مرمر۔۔۔۔۔ اور چو کے قابل مینر اور چو کی کے بہ نسبت قیمت سابق کے ارزاں ہیں۔ اگر ارشاد ہو تو تلاش کر کے اس کا حال بھی لکھیں۔“
(زبان داغ ص ۲۹۱)

شاہیہ کے ایک اور خط میں نواب کلب علی خاں کو لکھتے ہیں:

”و تو عوید سنگ مرمر کے ایسے دیکھے کہ ان کی خوبیاں بیان سے باہر ہیں، نہایت بڑے تعوید ہیں اور سب آیات قرآنی کندہ ہیں۔ یہ تعوید مثل تعوید شاہ جہاں واکبر تصور کرتے چاہیں۔ اگر قیمت بن جائے گی تو ضرور یہ جاسی گے نایاب شے ہے۔۔۔۔۔ ایک تعوید سنگ مرمر کلاں بہ قیمت چالیس روپیہ کو کل فدوی نے خرید لیا ہے، وہ بھی تین سو روپیہ سے کم کا نہیں، ذرا سا کونا اس کا ٹوٹا ہوا ہے۔ وہ درست ہو جائے گا۔ ایک شخص نے نیلام میں لیا

تھا، نفع دے کر لیا گیا ہے۔“

(زبان داغ ص ۲۴۸)

نوابین رام پور سے مراسلت کا یہ سلسلہ تقریباً ۲۶ سال پر محیط ہے۔ ان میں ایک خط کے علاوہ کسی میں اپنی مالی پریشانیوں یا طلب زر کے بارے میں نہیں لکھا گیا۔ اگرچہ بعض دوسرے لوگوں کے نام خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ باوجود یافت کافی ہونے کے اپنی شاہ خرچیوں کی بدولت تنگ دست رہتے تھے۔ مگر والیان ریاست سے خصوصی تعلقات کے باوجود یا شاید انھیں کے باعث ان کی غیرت نے ضابط کی مقررہ تنخواہ کے علاوہ کچھ طلب کرنا گوارہ نہیں کیا۔ حالانکہ اسی دور کے ہمارا جہر کش ہمارا بیڈار کے نام ایک خط میں داغ بہت ہی بیاکی سے روپیہ طلب کرتے ہیں۔ بیڈار داغ کے شاگرد تھے اور ان کے بہت سے معاملات میں خاص طور پر متنی بانی حجاب سے روابط کے سلسلے میں ان کے ہمارا تھے۔ طلب زر کے سلسلے میں ان سے بے تکلفی کچھ حد سے تجاوز کرتی نظر آتی ہے، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا جہر سے روپیہ اینٹھنا چاہتے ہیں: تحریر کرتے ہیں۔

”.... گرامی نامہ آیا۔ آنکھوں سے لگایا۔ خط جو کھول کر دیکھا تو نہ ٹوٹ پایا نہ ہنڈی، کل دار علیہ السلام عجیب چیز ہے۔ بالفصل داغ کلکتہ جانے والا ہے ایک ہزار تو ادھر کو سرکایے۔ دنیا میں جو کوئی رئیس ہوتا ہے بے اختیاری میں یہی لوازمات ریاست اور مستحق کا خیال رکھتا ہے۔ یہ ریاست ہی نئی دیکھی۔ میرا باپ بھی رئیس تھا اور بھی ریاستیں دیکھیں، بادشاہت بھی دیکھی، تعلقہ داروں کو بھی دیکھا۔ یہ بات کہیں نہیں دیکھی اور نہ یہ اُستادی شاگردی دیکھی۔“

(زبان داغ ص ۲۵۲)

سب سے زیادہ مالی دشواریوں کا سامنا داغ کو قیام حیدر آباد کے ابتدائی دور میں ہوا۔ جب تمام وسائل آمدنی مسدود ہو چکے تھے اور وہ ریاست میں امیدواری کی زندگی گزار رہے تھے۔ عرضی گذر چکی تھی، منظور بھی ہو چکی تھی لیکن اجرائے کار کا انتظار تھلا گزر بسر کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، اپنی حیثیت و مرتبہ کے انہار کے بلے وہ اپنے طریق بود و ماند

اصلاح لی۔ داغ کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں ایسے فنون بھی سیکھنے کا موقع ملا جو شہزادوں اور اعلیٰ ترین طبقوں کے لڑکوں کے لیے مخصوص تھے۔ داغ نے مرزا عبید اللہ بیگ سے بانک، مرزا سنگی بیگ سے پھکیتی، سجن خاں اور بندو خاں سے گھر سواری کے فنون پر بھی مہارت حاصل کی۔ اپنی ذہانت اور حسن سلوک سے داغ نے مرزا فخر و کے دل میں ایسی جگہ پیدا کر لی تھی کہ وہ داغ کی تربیت میں ذاتی دلچسپی لینے لگے۔ تیسرا اندازی چورنگ اور بندوق لگانا خود مرزا فخر و نے داغ کو سکھایا۔ داغ کا بیان ہے کہ انھوں نے دو چار غزلوں پر مرزا فخر و سے اصلاح بھی لی تھی۔ مرزا فخر و نے ان کا تخلص داغ قرار دیا تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ تخلص ذوق نے دیا تھا۔

لال قلعے میں شعر و شاعری کے ماحول نے داغ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو چمکانا شروع کیا۔ ایک دن مرزا فخر و نے داغ کو مشورہ دیا کہ وہ ذوق کے شاگرد ہو جائیں۔ بہ قول داغ ”میں حضرت ذوق کا شاگرد و خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ میں ہوا تھا، جہاں شاہ ظفر اور ولی عہد بہادر بھی تشریف فرما تھے۔ ثواب فتح الملک بہادر مرزا فخر و نے میری طرف سے حضرت ذوق کی خدمت میں ایک دو سالہ اور کچھ اشرفیاں پیش کیں۔ استاد نے اسی وقت ایک غزل پر اصلاح فرمائی۔ اس روز سے معمول ہو گیا کہ سہ پہر کے وقت استاد کے در و دولت پر حاضر ہوتا۔ مغرب کے بعد وہاں سے واپس ہوتی۔ بادشاہ کی غزل اور میری غزل پر خود اپنے دست و قلم سے اصلاح فرمایا کرتے تھے۔ باقی شاگردوں کی غزلیں ایک شخص پڑھتا جاتا اور استاد اصلاح دیتے جاتے، لیکن جب کوئی موجود نہ ہوتا تو خود ہی اصلاح فرمایا کرتے تھے۔۔۔۔۔ میں نے خاقانی ہند جناب ذوق سے کامل ۱۴ سال اصلاح لی تھی۔“

داغ کی اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہوگی کہ انھیں براہ راست مغل بیگمات، شہزادوں اور شہزادیوں سے اردوئے معلیٰ سیکھنے کا موقع ملا۔ اور فن شاعری کے رموز و اسرار استاد ذوق نے سکھائے۔

احسن مارہروی نے داغ کی شاعرانہ صلاحیتوں کے کچھ واقعات بیان کیے ہیں۔۔۔۔۔ دو تین آپ بھی سن لیجئے۔ مگر یہ، ان میں کچھ مبالغہ ہو، مگر ہیں دلچسپ داغ کی عمر گیارہ

کو عمدہ پیمانے پر برقرار رکھنے کے لیے بھی مجبور تھے۔ وہ قرض کے بوجھ تلے دیے جا رہے تھے۔ حیدر آباد میں نہ وہ کسی سے قرض لینا چاہتے تھے، نہ شاید مل سکتا تھا۔ انہیں حالات کے ضمن میں وہ لکھتے ہیں :

”میری کامیابی خاص حضور پر نور کی ذات سے متعلق ہے اور یہ ممانعت ہے اور کسی کے ممنون نہ ہونا۔ میں یہاں ایک اعلیٰ شخص گنا جاتا ہوں۔ بدگمانی کے دل میں بہت گنجائش ہے۔“

(زبان داغ ص ۱۴۷)

قرض کا یہ سلسلہ دہلی کے ساہوکاروں سے جاری تھا۔ لیکن وہ بھی کب تک۔ وہ گھبرا کر واپس ہونا چاہتے تھے لیکن بقول اُن کے :

”اہلِ رائے گھبرا کر چلے جانے کو یہاں سے پسند نہیں کرتے اور حضور پر نور بھی مانع ہیں۔“

(زبان داغ ص ۱۴۸)

اپنے ایک بے تکلف شاگرد۔ سعد آباد کے رئیس، کنور اعتماد علی خاں کو لکھتے ہیں :

”دلی چاندنی چوک میں شنبھونا تھا ایک بزاز مشہور ہے۔ قریب دو ہزار روپیہ کے اس کا دینا ہے۔ اس نے بڑا احسان کیا، عند الطلب و تناً فوقتاً بغیر دستاویز کے بھیجتا رہا، اب وہ برسرِ فساد ہے۔ کسی طرح سے چار مہینے تک اس کو سمجھا کر روکنا چاہیے، میری تحریر پر وہ عمل نہیں کرتا۔ تمھاری استانی کا خط جو گھر سے آیا بڑی پریشانی لکھی اور شنبھونا تھ کے تقاضہ شدید پر گھبرا گیا۔ کچھ بن نہ آیا تو آپ کو لکھا گیا۔“

(زبان داغ ص ۱۴۹)

اسی خط میں کنور صاحب سے قرض طلب کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

”آج آپ کا خط تار کے جواب میں آیا، اطمینان ہوا۔ ماہ مئی تک سو روپیہ ماہوار میرے پاس اپنا پاس روپیہ ماہوار اپنی استانی کے پاس بطور قرض اگر آپ

عنایت کیے جائیں تو عین نوازش ہے۔“

(زبانِ داغ ص ۱۴)

معلوم ہوتا ہے کنور صاحب نے اس تنگ وقت میں حسبِ ضرورت اُستاد کی مدد کی۔ داغ کی شرافت نفس نے اس اعانت کو یاد رکھا اور اس احسانِ مندی کا اعتراف کئی سال بعد کے خط میں کیا لکھتے ہیں :

”آپ نے وقتاً فوقتاً جو میرا خیال رکھا اور مجھے فکروں سے نجات دی، اس کی میرے دل میں بڑی قدر ہے۔ آپ کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتا۔۔۔۔۔ آپ نے اس وقت میری دست گیری فرمائی جب کہ میرے دن مجھے موافق نہ تھے۔ اب کہ خدا کا شکر ہے میں مطمئن ہوں، آپ کو بھول سکتا ہوں۔“

(زبانِ داغ ص ۱۴۹)

بقول خواجہ احمد فاروقی ”خط لکھنے کے لیے کاغذ اور قلم ہی کی نہیں، خونِ جگر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔“

(دکلاسیکی ادب ص ۱۲۴)

اس ”خونِ جگر“ کا رنگ ہماری خوشیوں اور غموں، محبتوں اور نفرتوں، کامیابیوں اور محرومیوں کی آویزش و آمیزش اور گوناگوں وارداتِ قلبی و نفسی سے عبارت ہوتا ہے معاشی مسائل و مراحل کے نشیب و فراز سے داغ پر جو کچھ بیتی، اس کا ذکر بھی ان خطوط میں ملتا ہے۔ لیکن قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ وہ ان تمام تحریروں میں ایک خاص سطح سے نیچے نہیں آتے۔ اُن محض نے کمتر ہی اپنی انانیت کا اظہار کیا ہے، لیکن کہیں بھی خوشامد پرستانہ لہجہ اختیار نہیں کیا۔ مذکورہ بالا خط میں اپنی احتیاج کے اظہار کے باوجود روپیہ محض قرض پر مانگا جا رہا ہے کہ جیسے ہی اجرائے تنخواہ ہو، ادا کر دیا جائے۔ ان کی شریفانہ خودداری طلبِ زر میں مانع آتی ہے۔ قرض خواہوں کا تقاضہ ندامت کا باعث بنتا ہے۔ سمجھنا تھا مذکور کو لکھتے ہیں :

”آپ کی دوست نوازی، ہمدردی و لطف و کرم کا دل پر گہرا نقش

ہے..... آپ کے خط کے چند جملے پڑھ کر جسم کے تمام روتنگے کھڑے ہو گئے،
جی سن سنا گیا، عرق انفعال میں نہا نہا گیا۔ ناحق آپ کیوں شرماتے ہیں جہاں
اتنے روز صبر کیا ہے، چند روز اور رکیے۔ سب مشکلیں خدا چاہے اب دور
ہو اہی چاہتی ہیں، کنارے آ لگا ہوں۔ نہ یہ وقت رہے گا اور نہ آپ کا رویہ
دیا ہوا مجھ پر باقی رہے گا۔“

(زبان داغ ص ۲۱۲)

لیکن ان سے بھی زیادہ اہم وہ خطوط ہیں جن میں داغ کے امور نفسی اور واردات
قلبی کا اظہار ہے۔ ان میں وہ خطوط بھی ہیں جو آنکھوں نے شاگردوں اور بے تکلف دوستوں
کو دکھے اور وہ بھی جو محبوبانِ دلربا کو دکھے گئے۔ حقیقتاً دیکھئے تو یہی وہ مکاتیب ہیں جن
میں ”خون جگر“ کی آمیزش ہے۔ جن میں صرف کاروباری معاملات نہیں بلکہ دل پر گزرنے
والی کیفیات اور خلصانہ گرجوش جذبات کا اظہار ہوا ہے۔ انھیں میں جذبات داغ کی
سچی تصویریں ملتی ہیں اور انھیں میں انشاءِ داغ اپنی بہترین شکل میں نظر آتی ہے۔
یہاں معاملہ رسمیات کا نہیں بلکہ ان احساسات کا ہے جو ان کے دل و دماغ کی گہرائیوں
سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کی بے نقاب شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

داغ نے قلعہ معلیٰ اور دربارِ رام پور کی عشق پرور فضاؤں میں آنکھ کھولی۔ ان
کو درنہ میں بھی کچھ اسی طرح کی روایات ملی تھیں۔ ان کے عاشقانہ جذبات کو پردان
چڑھانے کے لیے حالات بھی کم و بیش سازگار رہے۔ حسن پرستی ان کی فطرتِ ثانیہ بن
گئی۔ وہ حسن کے پرستار موسیقی کے دلدادہ اور شعر و شاعری کے رسیا تھے۔ ان تیتوں
کا امتزاج جہاں نظر آیا، ان کے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹا۔ بلکہ کبھی کبھی تو ایسی کسی
شخصیت کے بارے میں سن کر ہی وہ بے تاب ہو اٹھے۔ اربابِ نشاط سے ان کے تعلق
خاطر کی پہلی اطلاع ۱۸۶۵ء کے واقعہ سے متعلق ہے کہ جب کلکتہ کی طوائف مہنی بانی تجا ب
رام پور کے میلہ میں آئی اور داغ اس کو دل دے بیٹھے۔ یہ تیر شاید ان کے دل پر سب
سے کاری لگا کہ آخر عمر تک یہ تعلق برقرار رہا۔ کبھی نہایت زور شور کے ساتھ، کبھی دھیمے

انداز میں۔ نگارِ ان حسن فروش کب کسی کے پابند ہوئے۔ داغ عشق اور رقابت کی آگ میں تپتے رہے اور تڑپتے رہے۔ بیچ بیچ میں شاد کامی اور کامگاری کے مواقع بھی آئے۔ لیکن وہ تو ہمیشہ کیاب ہوتے ہیں۔ عاشقان بے نوا کا مقدر تو جِلنا اور تڑپنا ہی ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک موقع پر لکھے گئے خط کی یہ چند سطور ملاحظہ ہوں:

”ایک طرف دولت ہے، ریاست ہے اور ہر طرح کی شان و شوکت لیکن محبت کا نام وہاں عنقا رکھا گیا ہے۔ تمہارا دل دادہ ان کے مقابلے میں کوئی خوبی نہیں رکھتا، مگر تمہاری الفت میں جان سے گزر سکتا ہے، کیا میرے رقیب بھی ایسا کر سکتے ہیں؟ تم کو یقین ہے (نہیں) اور جب نہیں کر سکتے تو پھر کس لیے تم داغ سے پرستار کو تحفے کیے ہو۔ دل پر جبر کر کے لکھتا ہوں کہ اگر قطعی ترک تعلق منظور و پسند نہیں تو پھر مجھے دید و شنید سے کیوں محروم رکھا جاتا ہے۔“

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم در راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
(زبان داغ ص ۱۸۳)

اس عبارت کو دیکھیے تو اس کی زبان، اس کے ترشے ترشائے جملے۔ اس کی روانی محولہ بالا تمام عبارتوں سے مختلف ہے۔ وجہ وہی کہ اس میں ان کے جذبات اور وہ بھی سچے جذبات موج زن ہیں۔ ان جملوں میں الفاظ کی بندش، ان کے اشعار کی طرح ہی چست ہے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ خط یا اس طرح کے دوسرے خطوط سرسری انداز میں نہیں لکھے گئے۔ بلکہ ان کی نوک پلک اسی طرح درست کی گئی ہوگی، جیسے توجہ سے اشعار کو سنوارا جاتا تھا۔ یہ تو جذبہ رقابت کا اظہار تھا، ذرا والہانہ اظہار کو بھی دیکھتے چلیں۔ حجاب ہی کو لکھتے ہیں:

”بائی جی! سلام شوق۔“

غضب تو یہ ہے کہ دور بیٹھی ہو، پاس ہوتیں تو سیر ہوتی، کبھی تمہارے گرد

گھومتا اور شعلہ جو الابن جاتا، کبھی تمھیں شمع قرار دیتا اور پننگا بن کر قربان ہو ہو جاتا، کبھی بلائیں لیتا اور کبھی صدقے قربان ہو جاتا۔ ایک خط بھیجا ہے ابھی اس کے انتظار کی مدت ختم نہیں ہوئی ہے کہ یہ دوسرا خط لکھوانے لگا۔

حجاب کے نام گیارہ خط ہیں۔ ان میں ہر طرح کے جذبات نظر آتے ہیں، اظہارِ شیعہ سنگی بھی ہے، شکوہ و شکایت بھی، سوزاں بھی اور کہیں وصل کی شاد کامی بھی۔ یوں تو داغ نے دوسرے خطوط میں القاب و آداب میں تنوع پیدا کیا ہے، لیکن ان خطوط میں ہر خط کا مخاطب، مضمون خط سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

یوں تو داغ کی زندگی میں نہ جاتے ایسے کتنے عشوہ فروش آئے، لیکن خطوط صرف چار کے نام ملتے ہیں۔ الہ آباد کی کسی نبی جان کے نام خط بہت دلچسپ ہے۔ توجہ ناردی الہ آباد سے استاد کی قدم بوسی کے لیے حیدر آباد آئے تو وہاں کی کسی طوائف بنی جان کی تصویر بھی استاد کو سوغات کے طور پر پیش کی۔ یہ تصویر استاد کے دل پر تیر بن کر لگی۔

”سیرت کی تعریف سنی تو صورت سے بڑھ کر خوش آواز، خوش مزاج، پھر اس پر پڑھی لکھی“

نادیدہ ہی دل دے بیٹھے۔ حیدر آباد سے الہ آباد جانا تو شاید مشکل تھا، القاب لکھا:

”حور کی صورت نور کی صورت خوش رہو اور ہم سے ملو۔“

تصویر کو دیکھ کر جو کچھ گزری اس کا تذکرہ کیا۔ نصف ملاقات یعنی خط پر اکتفا کیا۔ اس خط کی چند سطور ملاحظہ کیجئے:

”کیوں جی تم سے کیوں کر ملیں، تم کو کیوں کر دیکھیں، کیوں کر سنین اور نہ دیکھیں تو کیوں کر جییں۔ جو شخص ازلی عاشق مزاج ہو خیال کرو اس کا کیا حال ہو گا۔ تم سے یہ اُمید نہیں کہ خواب میں بھی کبھی آؤ۔ ہائے مجبوری دئے تجھ پر،“

(زبان داغ ص ۱۴)

شاگردوں کو جو بہت سے خطوط لکھے گئے ان میں ادبی مباحث کم تر ہی آئے ہیں۔ ان میں یا تو معاملات ہیں یا اطلاعات! کسی لفظی یا لغوی تحقیق کو داغ نے نہیں چھوا۔ وہ زبان کے اداساس ہی نہیں بلکہ اس کی شستگی و رنگی کے دلدادہ تھے۔ محاورہ زبان کا اس ادب جس

ہوتا ہے۔ داغ محاورہ بندی کے بادشاہ تھے۔ محاورہ و روزمرہ دہلی کو نہ صرف مستند سمجھے تھے بلکہ اس کی بقا کے لیے متر و درہتے تھے۔ خود بھی اپنی شاعری کے ذریعہ اس کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ شاگردوں کو بھی براہ تاکید اور ہدایت ہوتی تھی کہ زبان دہلی کو اپنے کلام کے ذریعہ رائج کریں۔ بے خود دہلوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”گلدستہ زبان اردو جو راسخ نے نکالا ہے، اس کو ردق کلام سے دو کہ زبان دہلی ختم ہوئی جاتی ہے۔“

(زبان داغ ص ۱۵)

در زبان دہلی ”کو وہ صرف شہر دہلی کی زبان تک محدود نہیں کرتے تھے بلکہ اس کا دائرہ نواحی قصبات تک پھیلا ہوا تھا۔ ناطق گلاؤ گھٹی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”آخر آپ خود بھی تو نواح دہلی کے باشندے ہیں اور میرے نزدیک بڑی حد تک آپ کے قصبات کی زبان مستند ہے۔“

(النشائے داغ ص ۱۲۲)

ناطق کو اسی خط میں ان کی محاورہ بندی کے سلسلے میں تعریفی کلمات سے نوازا ہے۔ لکھتے ہیں:

”یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ ہر شعر میں کسی محاورے کا استعمال کرتے ہیں اور بیشتر کامیابی کے ساتھ مگر اس کا لحاظ رکھیے کہ شعر کے لیے محاورہ آجائے۔ محاورہ کے لیے شعر میں سقم نہ آنے پائے اور یہ بھی خیال رہے کہ اس میں تصرف جائز نہیں۔ اگر آسانی کے ساتھ محاورہ بجنسہ بحر میں آجائے تو نظم کو ردیجے، ورنہ نہیں اور اس کے لیے حضرت استاد مرحوم کے کلام پر غور کیجیے کہ انھوں نے کس بے ساختگی سے محاورات کو باندھا ہے۔“

(النشائے داغ ص ۱۲۳)

اس اقتباس سے جہاں داغ کے ذوق محاورہ بندی پر روشنی پڑتی ہے وہیں وہ اصول بھی سامنے آتے ہیں جنہیں استعمال محاورہ کے سلسلے میں وہ پیش نظر رکھتے

تھے اور انھیں پرکار بند رہنے کے لیے اپنے تلامذہ سے بھی اجہار کرتے تھے۔
 ”فصح اللغات“ دراصل لغات المحاورہ ہی ہے جس کی ترتیب کی ذمہ داری حسن مارہروی
 نے قبول کی تھی۔ کلام دآغ میں مستعمل محاورات کی جمع و ترتیب کے علاوہ احسن الفاظ و
 محاورات دآغ کو مہیا کرتے جتھیں وہ اشعار میں باندھ دیتے تھے۔ ۱۹۰۲ء کے ایک خط
 میں احسن مارہروی کو لکھتے ہیں :

”آپ کا خط آیا۔ آپ کہتے ہیں کہ میں سفر کرتا ہوں۔ خدا مبارک کرے۔ فصیح اللغات
 کا انتظام کیا کر کے جائیے گا۔ یقین ہے کہ الفاظ میرے پاس آئیں گے۔ جو آئے
 تھے، ان کے شعر میں نے بھجوا دیے۔ پہلے جو الفاظ تم نے بھیجے تھے وہ میرے
 پاس سے گم ہو گئے۔ ان کے واسطے لکھا تھا کہ مکرر بھیجو۔ جواب تم نے نہیں دیا“
 (زبان دآغ صفحہ ۵۸-۵۷)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

”اسناد کے الفاظ اور بھیجو۔ اس وقت طبیعت لگ گئی جو یہ شعر کہے۔“

(زبان دآغ صفحہ ۵۶)

احسن حیدر آباد آگئے تو یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ کچھ معاملات بھی خراب ہو گئے۔ دآغ
 اس پر بہت برہم ہیں۔ تقریباً دو سال تک متعدد خط لکھے جن میں نہایت خفگی کا اظہار ہے
 ان میں جہاں فصیح اللغات کی تکمیل نہ ہونے کا تا سست و ملال ہے، وہیں عدم صفائی معاملات
 پر بھی ناراضگی ہے۔ دآغ کی شخصیت کے ایک پہلو پر ان خطوط سے بھی روشنی پڑتی ہے۔
 ۱۹۰۲ء کے آخر میں معاملات رو براہ ہو گئے ہیں۔ اور یہ دآغ کی وسیع النظری ہے کہ انھوں
 نے یک لخت ساری خفگی کو بھلا دیا۔ لکھتے ہیں :

”میں نہ درحقیقت تم سے ناراض تھا، اور نہ ناراض ہوں اور نہ اب کوئی

وجہ ناراضگی ہے۔ تم نے جو الفاظ بھیجے ہیں، ان پر اشعار کہہ کر جلد بھیجتا ہوں“

(زبان دآغ صفحہ ۵۹)

گویا فصیح اللغات کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا ہے۔ لیکن موت نے جہالت نہ دی اور

یہ لغت پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔

دآغ اردو کے اہم شاعروں میں ہیں۔ لیکن جیسا شروع میں عرض کیا گیا۔ انھوں نے
نثر کی طرف مناسب توجہ نہیں کی۔ مراسلت ضرورتاً کرتے تھے۔ اور اس لیے اس میں شعر
گوئی کا سا اہتمام نہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے ان کی نثر میں کوئی ادبی شان پیدا نہیں ہوئی لیکن
یہ بات صرف دآغ کی نسبت سے کہی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ خطوط ناقابل
اعتنا ہیں۔ ان خطوط سے دآغ کی زندگی کے بہت سے واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے
بہت سے معاملات، بعض امور میں ان کے دلی جذبات اور مختلف افراد سے ان کے مراسم
کی نوعیت کا ان خطوط سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ
ان میں سے بعض خطوط اپنی ادبی حیثیت میں اعلیٰ درجے پر رکھے جاسکتے ہیں اور انشا پر داری
کا عمدہ نمونہ پیش کرتے ہیں۔

داع کے اثرات، اقبال پر

اقبال فکری اعتبار سے دنیا کے متعدد فلسفیوں سے متاثر ہوئے ہیں اور شعری اعتبار سے دنیا کے کئی شعراء سے جن میں اردو کے شعراء بھی شامل ہیں۔ ہر من ہمیں نے اقبال کو تین اقلیموں کا شاعر کہا ہے اور ہمیں کے بقول ان تین اقلیموں میں ایک اقلیم قدیم ہندوستانی فلسفہ ہے۔ دوسری اقلیم ہے یورپی فلسفہ اور تیسری اقلیم ہے اسلامی فلسفہ۔ لیکن یہ تو فلسفے کی بات ہوئی۔ شاعری کا جہاں تک تعلق ہے اقبال متعذر شعراء سے متاثر ہوئے ہیں اور ان کے کلام کے اکثر حصوں پر ان شعراء کی چھاپ نظر آتی ہے جیسے ”شکوہ“ پر میر تقی میر کی واسوخت کا اور ”پنجاب کا جواب“ پر میر انیس کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ لیکن جب ہم بالخصوص اس موضوع پر بات کرتے ہیں کہ داع کے اقبال پر کیا اثرات رہے ہیں تو ہمارے پیش نظریہ حقیقت ہوتی ہے کہ داع اقبال کے استاد تھے اور اقبال نے ایک مدت تک داع کے رنگ میں غزلیں کہی ہیں۔ یہاں ایک بات جملہ معترضہ کے طور پر میں یہ عرض کر دوں کہ بقول سید ندیر نیازی شاعری میں اقبال کے پہلے استاد مولوی میر حسن ہیں۔ اگرچہ میں اپنے ایک مقالے میں اس بات کی تردید کر

چکا ہوں اور اس سلسلے میں میری دلیل یہ ہے کہ اقبال کے اپنے بیان کی روشنی میں اس بات کی واضح تردید ہمیں نظر آتی ہے لیکن چوں کہ یہ دعویٰ سید نذیر نیازی نے کیا ہے اس لیے اسے نظر انداز کرنے کے عوض میں نے یہ سوچا کہ برسبیل تذکرہ ہی سہی اس کا ذکر یہاں کر دوں۔ گویا راقم الحروف کے نزدیک یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعری میں اقبال کے پہلے اور آخری استاد فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی تھے۔ ایک آدھ شعر پر مشورہ لینے کی بات دوسری ہے۔ میرے استاد شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم نے مجھے بتایا تھا اور لاہور کے بعض اور صاحب نظر حضرات نے اس کی تائید کی کہ علامہ کا یہ شعر ہے

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آلباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اپنی اصل صورت میں یوں تھا ہے

کبھی اے حقیقت مستتر نظر آلباس مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

مولانا غلام قادر گرامی نے پہلے مصرعے میں لفظ ”مستتر“ کو بدل کے ”منتظر“ کر دیا۔ لاہور کے بعض معر حضرات جو اس واقعے کی تائید کرتے تھے گرامی مرحوم کا ایک خاص پنجابی جملہ دہراتے ہوئے یہ واقعہ بیان کیا کرتے تھے اور وہ جملہ یہ ہے ”اوتے ڈاکٹر حبیب“ اے مستتر کی لفظ اویا۔ منتظر سامنے والا لفظ اے۔ ایدائینوں خیال ای نہیں آیا؟ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ”اسرارِ خودی“ کا مسودہ علامہ نے اشاعت سے قبل سارے کا سارا مولانا گرامی مرحوم کو دکھایا راقم التحریر کے علم میں یہ بات نہیں کہ گرامی نے ”اسرارِ خودی“ کے کسی شعر یا مصرعے میں کوئی تبدیلی کی یا نہیں۔

اسی طرح پروفیسر آرنلڈ کے مشورے پر علامہ مرحوم نے اپنی پہلی تصنیف ”علم الاقتصا“ کا مسودہ علامہ شبلی مرحوم کی خدمت میں بھیجا تھا۔ مولانا شبلی نے اس مسودے میں جا بجا ترمیم و تصحیح کی تھی جس کا اقبال نے خود ”علم الاقتصاد“ کے دیباچے میں اعتراف کیا ہے، مگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ نثر میں علامہ شبلی اور اقبال میں استاد اور شاگرد کا رشتہ تھا۔ لیکن داغ مرحوم

بارہ سال ہے ابھی قلعے کا ماحول نصیب نہیں ہوا۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفۃ کے ہاں مشاعرہ ہوا۔ داغ نے بھی غزل پڑھی۔ اس غزل کے مطلع نے سخن فہموں کو حیرت میں ڈال دیا۔ مطلع تھا:

شرر و برق نہیں شعلہ و سیلاب نہیں
کس لیے پھر یہ ٹھہرتا دل بیتاب نہیں
دہلی کے محلّہ زینت باڑی میں مشاعرہ تھا۔ طرحی مشاعرہ تھا۔ گیسو اپنا۔ جادو اپنا۔ داغ نے جب یہ شعر پڑھا:

لگ گئی چپ تجھے اے داغِ حزیں کیوں ایسی
مجھ کو کچھ حال تو کم بخت بتا تو اپنا
اس شعر پر مولوی امام بخش صہبانی جھوم اٹھے اور انھوں نے داغ کو گلے سے لگالیا۔
ایک دفعہ غالب نے قلعے میں وہ غزل پڑھی، جس کا شعر ہے
نکلتا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے، لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
بادشاہ کو یہ زمین بہت پسند آئی، حکم ہوا کہ اس طرح میں مشاعرہ ہو۔ چنانچہ مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ یہ قول داغ ”ہماری جوانی کا زمانہ تھا، طبیعت پورے جوش پر تھی۔ ہم نے بھی غزل کہی اور مشاعرے میں پہنچے۔ جب یہ شعر پڑھا:

ہوئے مغرور جب کہ آہ میری بے اثر دکھی
کسی کا اس طرح یار نہ دنیا میں بھرم نکلے
بادشاہ نے بہت داد دی اور اپنے پاس بلا کر میری پیشانی کو بوسہ دیا۔
غالب بھی اس نوجوان شاعر کے ملاخوں میں تھے۔ بقول داغ
”میں نے مرزا غالب کی مشہور غزل

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

کے ساتھ اقبال کا تعلق دوسرا تھا۔ انھوں نے باقاعدہ داغ کو خط لکھ کے ان کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس ضمن میں شیخ سر عبد القادر بانگ دراکے دیباچے میں لکھتے ہیں:- ”شعراے اردو میں اُن دنوں نواب مرزا خان صاحب داغ دہلوی کا بہت شہرہ تھا، اور نظام دکن کے اُستاد ہونے سے ان کی شہرت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ لوگ جو اُن کے پاس جا نہیں سکتے تھے خط و کتابت کے ذریعہ دوری سے ان سے شاگردی کی نسبت پیدا کرتے تھے۔ غزلیں ڈاک میں ان کے پاس جاتی تھیں اور وہ اصلاح کے بعد واپس بھیجتے تھے۔ پچھلے زمانے میں جب ڈاک کا یہ انتظام نہ تھا کسی شاعر کو اتنے شاگرد کیسے میسر آ سکتے تھے۔ اب اس سہولت کی وجہ سے یہ حال تھا کہ سینکڑوں آدمی ان سے غائبانہ تلمذ رکھتے تھے اور انھیں اس کام کے لئے ایک علمہ اور محکمہ رکھنا پڑتا تھا۔ شیخ محمد اقبال نے بھی انھیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لئے بھیجیں۔ اس طرح اقبال کو اردو زبان دانی کے لئے بھی ایسے اُستاد سے نسبت پیدا ہوئی جو اپنے وقت میں زبان کی خوبی کے لحاظ سے فن غزل میں کیلتا سمجھا جاتا تھا گو اس ابتدائی غزل گوئی میں وہ باتیں تو موجود نہ تھیں جن سے بعد ازاں کلام اقبال نے شہرت پائی مگر جناب داغ پہچان گئے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع کا بی طالب علم کوئی معولی غزل گو نہیں۔ انھوں نے جلد کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے اور یہ سلسلہ تلمذ کا بہت دیر تک قائم نہیں رہا۔ البتہ اس کی یاد دونوں طرف رہ گئی۔ داغ کا نام اردو شاعری میں ایسا پایہ رکھتا ہے کہ اقبال کے دل میں داغ سے اس مختصر اور غائبانہ تعلق کی بھی قدر ہے اور اقبال نے داغ کی زندگی ہی میں قبول عام کا وہ درجہ حاصل کر لیا تھا کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام کی انھوں نے اصلاح کی۔ مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سنے۔“

(۲)

عام طور سے سمجھایا جاتا ہے کہ جب ہم کسی شاعر کی زمین میں شعر کہتے ہیں تو اس سے متاثر ہو کر کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ بات کبھی کبھی صحیح بھی ہو لیکن ہمیشہ صحیح نہیں ہوتی۔ فرض کیجئے کسی نے مصرع طرح دیا ہے اور ہم اس مصرع پر غزل کہتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ ہمیں یہ بھی معلوم

نہ ہو کہ یہ کس شاعر کا مصرع ہے اور اگر معلوم ہو بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ شاعر ہمارا پسندیدہ شاعر نہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصرع طرح نہ دیا جائے لیکن ہمارے تحت اشعار میں کوئی مصرع ہو اور ہم اس پر غزل کہیں۔ اس صورت میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم نے فلاں شاعر سے متاثر ہو کر اس زمین میں غزل کہی ہے۔

لیکن یہ بات اقبال اور داغ کے تعلق سے نہیں کہی جاسکتی۔ داغ کا اپنے استاد کے طور پر اقبال نے خود انتخاب کیا تھا اور ایسے وقت میں جب اکبر اور حالی ایسے شعراء دنیا کے ادب میں موجود تھے۔ اکبر اور حالی وہ شاعر ہیں جن کے ساتھ اقبال مزاجی طور پر ہم آہنگ ہیں۔ داغ کے ساتھ اقبال کی فکری یا مزاجی ہم آہنگی نہیں ہے لیکن اس کا انکشاف اقبال پر غالباً ذرا بعد میں ہوا۔

اقبال جب سیال کوٹ میں تھے اور یہ ۱۸۹۵ء سے پہلے کی بات ہے اُس وقت اقبال ایک تو داغ کے اس فلسفے سے متاثر ہوئے ہوں گے جو اُس زمانے میں ملک کے طول و عرض میں برپا تھا۔ دوسرا داغ کی زبان کے چٹخارے سے، اور پھر ہو سکتا ہے کہ انھیں مولوی میر حسن یا دوسرے بزرگوں نے مشورہ بھی دیا ہو کہ داغ کے شاگرد بن جاؤ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اس مشورے کو قبول کرنے میں اقبال کی اپنی رضامندی کو بھی دخل رہا ہو گا۔

یہ دراصل اقبال کے لڑکپن کا دور تھا اور اقبال نے ابھی تک اپنی آواز کی دریافت نہیں کی تھی اس لئے انھوں نے کمال فن اسی کو سمجھا کہ داغ کے انداز میں، داغ کی زمینوں میں غزل کہیں۔ اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ داغ ان کے اعصاب پر چھائے ہوئے ہیں اور یہ بات داغ کی زمینوں میں کہی ہوئی غزلوں کے علاوہ اس قسم کے اشعار سے بھی ظاہر ہے۔

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں است
مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغ سخندان کا
جناب داغ کی اقبال یہ ساری کرامت ہے
ترے جیسے کو کر ڈالا سخندان بھی سخنور بھی

گرم ہوتا ہے کبھی ہم یہ جو وہ بُت اقبال

حضرت داغ کے اشعار سنار دیتے ہیں

لیکن دراصل اقبال ایک نور سیدہ پودے کی طرح مختلف اطراف سے اثرات قبول کر

رہے تھے۔ پودا زمین سے بھی اتر لیتا ہے، سورج کی روشنی سے بھی، دوسرے فضائی عناصر سے بھی لیکن اس اثر پذیری میں مالی کی دیکھ بھال کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ سنگترے میں ماٹے کا پیوند لگا کر اسے کنیو کی شکل دے دیتا ہے۔ ایک پھول میں دوسرے پھول کا رنگ دبو شامل کر کے ایک نیا پھول معرض وجود میں لے آتا ہے۔ یہی اثرِ داغ کا اقبال کے کلام پر ہوا اور کچھ مدت تک داغ کے تربیت یافتہ اقبال کی شاعری داغ کے رنگ میں بھی رہی اور اس پر اقبال کا اپنا رنگِ طبیعت بھی کبھی کبھی شبِ خون مارتا رہا جس سے اقبال بہت دن تک بے خبر رہے۔

اقبال کی ابتدائی شاعری کے زمانے میں غالب کی معنی آفرینی بھی ان کے سامنے تھی اور ان کا روحِ تخیل بھی۔

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

حالی کی غزل بھی ان کی نظر سے گزری ہوگی اور مقدمہٴ شعر و شاعری بھی، امیر مینائی کی شاعری بھی ان کے سامنے تھی، بلکہ لاہور کے ایک مشاعرے میں جو بابرِ حکیمان میں منعقد ہوا تھا امیر مینائی کی زبان سے وہ ان کا کلام بھی سن چکے تھے اور ایک دور میں بات یہاں تک بھی پہنچی تھی کہ وہ عجیب سے بے صنم خانہٴ امیرِ اقبال میں بت پرست ہوں رکھ دی کہیں جن میں

جب اقبال کی ابتدائی زمانے کی شاعری کا ذکر ہوتا ہے تو ۱۸۹۵ء کی ایک غزل کے اس شعر کا ذکر خاص طور سے کیا جاتا ہے

اقبال لکھنؤ سے نہ دلتی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

اس شعر میں ”اسیر“ اور ”خمِ زلف“ کی موجودگی کے باوجود یہ شعر اس خمِ زلف کی اسیری سے آزاد ہے جو حضرت داغ کی دین ہو سکتی تھی۔ اس کا انداز مختلف ہے اور اقبال تخلیقِ شعر کے بارے میں جس انداز سے سوچ رہے تھے اس کی طرف ہماری رہنمائی خمِ زلف کے ذریعے سے نہیں ہو رہی ہے بلکہ خمِ زلفِ کمال کے ذریعے سے ہو رہی ہے۔ لیکن اس غزل کے باقی چند اشعار دیکھیے۔

داغ کا تتبع واضح طور پر نمایاں ہے۔

تم آزمادہ "ہاں" کو زباں سے نکال کے
کم بخت اک "نہیں" کی ہزاروں ہیں صورتیں
جادو عجب نگاہِ خسریہ اردل میں تھا
ہم موت ملگتے ہیں وہ گھبرائے جلتے ہیں
مارے ہیں آسماں نے مجھے تاک تاک کر
ان کی گلی میں اور کچھ اندھیر ہو نہ جانے
چلتے ہوئے کسی کا جو آنچل سرک گیا
حسرت نہیں کسی کی تمنا نہیں ہوں میں
میں نے کہا کہ بے دہنی اور گالیاں؛
کہتے ہیں ہنس کے جایتے ہم سے نہ بولیے
بگڑے حیا نہ سبر نخی رفتار سے کہیں
تصویر میں نے مانگی تو ہنس کر دیا جواب

لیکن اب اسی غزل کے یہ دو شعر دیکھیے

اے ضبط ہو شیاؤں مرا حرفِ مدعا
موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے

ان دو اشعار کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سو فی صدی داغ کا رنگ لیے ہوئے

ہیں۔ اگرچہ ان میں ہلکی سی داغ کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے لیکن ان میں اُس
اقبال کی ایک ہلکی سی جھلک بھی نظر آ رہی ہے جو بعد میں رنگِ داغ کی شاعری سے بیزار ہونے
والا تھا۔ قریب قریب یہی بات مجھے اس شعر کے بارے میں بھی کہنا ہے۔

کہتا ہے پھر و شہتِ جنوں میں مجھے کہ چل

آتا ہوں میں بھی پاؤں سے کانٹا نکال کے

یہ شعر اُسی فکر و فن کا امتزاج ہے جو پورے دس برس بعد اس شعر کی صورت میں

یہ صدقے ہو گئی میرے سوالِ وصال کے
ہوتے ہیں سو جواب سوالِ وصال کے
بکتا ہے ساتھ بیچنے والا بھی مال کے
سمجھے انھوں نے اور ہی معنی وصال کے
کیا بے خطا ہیں تیرے کمانِ ہلال کے
اے ضعف! دیکھ مجھ کو گرانا سنبھال کے
بولی حیا حضور، دوپٹہ سنبھال کے
مجھ کو نکالیے گا ذرا دیکھ بھال کے
کہنے لگے کہ بول ذرا منہ سنبھال کے
قربان جاؤں طرزِ بیانِ ملال کے
چلتے نہیں وہ اپنا دوپٹہ سنبھال کے
عاشق ہوئے ہو تم تو کسی بے مثال کے

قابو میں آنے جائے زبانِ سوال کے

قطرے جو تھے مہے غرقِ انفعال کے

ان دو اشعار کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سو فی صدی داغ کا رنگ لیے ہوئے

ہیں۔ اگرچہ ان میں ہلکی سی داغ کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے لیکن ان میں اُس
اقبال کی ایک ہلکی سی جھلک بھی نظر آ رہی ہے جو بعد میں رنگِ داغ کی شاعری سے بیزار ہونے
والا تھا۔ قریب قریب یہی بات مجھے اس شعر کے بارے میں بھی کہنا ہے۔

کہتا ہے پھر و شہتِ جنوں میں مجھے کہ چل

آتا ہوں میں بھی پاؤں سے کانٹا نکال کے

یہ شعر اُسی فکر و فن کا امتزاج ہے جو پورے دس برس بعد اس شعر کی صورت میں

ظاہر ہوا۔

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خود کشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے
اب اس غزل کے ساتھ ہی داغ کی بعض زمینوں میں اقبال کی چند غزلیں دیکھئے۔ داغ
کی ایک غزل ہے

ان آنکھوں نے کیا کیا تراشنا نہ دیکھا
حقیقت میں جو دیکھنا تھا نہ دیکھا

یہ داغ کی ۴ اشعار کی غزل ہے۔ اس زمین میں اقبال کے صرف چار شعر ملتے ہیں۔ یہ میں
اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ داغ کی اکثر مختصر غزلوں کے مقابلے میں اقبال نے بہت طویل غزلیں
کہی ہیں۔

کبھی جزو فطرت ہے اہل ستم کی کبھی ہم نے خنجر کو سیدھا نہ دیکھا
بہت تو نے اے آنکھ دیکھے تماشے جسے دیکھنا دیکھنا تھا نہ دیکھا
ظہور و عدم اپنا مثلی شر تھا یہ سمجھو کہ دنیا کو دیکھنا نہ دیکھا
اگرچہ پھر میں بہت اس چمن میں
کسی نے مرا آنا جانا نہ دیکھا
اب داغ کی ایک اور غزل دیکھئے۔

بزم گلشن میں نہ کھلنا گلِ تری سموت
جاؤ بجلی کی طرح آؤ نظر کی صورت
یہ غزل مقطع کے بغیر ہے اور آخری شعر ہے۔

کوئی دم کوئی گھڑی کل نہیں پڑتی دل کو
میں بیاں کس سے کروں آٹھ پہر کی صورت

اقبال کہتے ہیں

تو نہاں مجھ سے مرے داغِ جگر کی صورت میں نہاں تجھ سے ترے موئے کمر کی صورت

خیر کیا بات ہے پتھر ہے اگر دل تیرا
کوچہ عشق کے یہ راہ نہا ہنستے ہیں
وصل کی رات تو آخر ہوئی اے دامن صبر
گر پڑا شیشہ دل سنگ در جاناں پر
خون اب دل میں نہیں اے رہ آفت باقی
کیوں نہ آنکھوں پر بٹھاؤں تجھے اے روزنہ
میں تو دیوانہ ہوا خیر کوئی بات نہ تھی
ہو شگفتہ ترے دم سے چمن دہر تمام
نام روشن تو رہے عمر ہو گو برق خرام
یہ تو بتلا دے مؤذن کہ تری آنکھوں سے
جوش میں بحر محبت تھا، مگر دل اپنا
دہر میں ذوق سکون تجھ کو ہے پیغام فنا
ضرب شمشیر حوادث سے نہ کھو قوت ضبط
ہے گلِ دلالت کی صورت تو اُنہی سی لیکن

ہم بھی اس سنگ میں رہتے ہیں شر کی صورت
اللہ اللہ کوئی دیکھے تو خضر کی صورت
چاک ہو تو بھی گریبانِ سحر کی صورت
یہ بھی ٹوٹے گا یہیں کاسہ سر کی صورت
ختم ہو تو بھی کہیں زادِ سفر کی صورت
تو دکھاتا ہے کسی رشکِ قمر کی صورت
آپ کیوں پھر گئے لیکن مرے سر کی صورت
سیر اس باغ کی کمر بادِ سحر کی صورت
زندگی چاہیے دنیا میں شر کی صورت
کیا مروت بھی گئی خوابِ سحر کی صورت
صاف نکلا ننگ دیدہ تر کی صورت
تازہ رکھ جوشِ سفر شمس و قمر کی صورت
سخت خود دار ہو دنیا میں سپر کی صورت
ان میں یہ سوز نہیں قلب و جگر کی صورت

لطف جب آتا ہے اقبال سخن گوئی کا

شعر نکلے صدقِ دل سے گہر کی صورت

اب یہ غزل واضح طور پر دو حصوں میں منقسم نظر آتی ہے۔ ہو سکتا ہے دونوں حصوں میں کچھ بعد زمانی بھی حاصل ہو۔ پہلا حصہ جو اس شعر پر ختم ہو رہا ہے۔

میں تو دیوانہ ہوا خیر کوئی بات نہ تھی

آپ کیوں پھر گئے لیکن مرے سر کی صورت

ہر اعتبار سے رسمی اور عامیانه شاعری کی مثال ہے اور جسے میں نے دوسرا حصہ کہا ہے (حالانکہ غزل میں حصے نہیں ہوتے، اس میں اقبال کے کئی تصورات جنھوں نے بعد میں مکمل طور پر نظریات کی صورت اختیار کی شعر میں ڈھلتے نظر آتے ہیں۔ بالخصوص

ان اشعار میں جو خیالات ادا ہوئے ہیں وہ بعد میں اقبال کے نظام فکر کا جزو بنے۔

نام روشن تو رہے مگر ہو گو برق خرام زندگی چاہے ہیں دنیا میں شر کی صورت
دہر میں ذوق سکون تجھ کو ہے پیغام فنا تازہ رکھ جوش سفر شمس و قمر کی صورت
ہے گل دلالت کی صورت تو انھی سی لیکن

ان میں یہ سوز نہیں قلب و جگر کی صورت

داغ کا ایک سہ غزلہ ہے جس کے مطلع یہ ہیں

کر گیا تاثیر ناہ بلبل ناشاد کا

ماتھ لینا پاؤں اب جتنا نہیں صیاد کا

اور

پر نہ باندھے پاؤں یا نہ ہا بلبل ناشاد کا

کھیل کے دن ہیں لڑکپن ہے ابھی صیاد کا

اور

ہوا اثر اتنا تو سوز ناہ و فریاد کا

ہم تماشا دیکھ لیں گھر پھونک کر صیاد کا

اقبال نے اس زمین میں دو غزلیں کہی ہیں جن میں سے ایک بقید یک قافیہ ہے۔

کیا مزہ بلبل کو آ یا شیدہ بیاد کا	ڈھونڈتی پھرتی ہے اڑا کر جو گھر صیاد کا
کس بُت پردہ نشیں کے عشق میں ہوں مبتلا	حسرت دل پر ہے برقع دامن فریاد کا
جب دُعا بہر اثر مانگی تو یہ پایا جواب	غیر رو کر لے گئے حصہ تری فریاد کا
ہوں وہ ناداں ڈر سے زیرِ دام پنہاں ہوا	دور سے چہرہ نظر آیا اگر صیاد کا
سُن کے اُس کو بے رُخی سے بھاگ جاتا ہوا	کیا اثر معشوق ہے اے دل تری فریاد کا
شرم جب آئی مری رگ میں لہو نکلا نہ کچھ	آپ میں ہے غرق گویا نیشتر فضا کا
قمریوں نے باغ میں دیکھا ہے اس خوش فکر کیا	ہے ٹھہری اُن کے لئے پتہ ہراک شمشاد کا
بھول جلتے ہیں مجھے سب یار کے جور و ستم	میں تو دیوانہ ہوں اے اقبال تیری یاد کا

اور دوسری غزل جو بقید یک قافیہ ہے یہ ہے۔

کام بلبل نے کیا ہے مانی وہ ہزار کا
پہلے یہ بیگانگی ہم کو نظر آئی نہ تھی
چلتے چلتے باغ میں بلبل نے یوں گل سے کہا
کچھ کہہ دیتے ہوں کی کچھ دھواں آہو کل ہو
یاد گلشن ہے زباں پر لب پہ ذکرِ آشتیاں
بیکسوں کے پاس کون آئے نفس میں ہمعفیر
ہائے کس کس لطف سے ظالم نے بتلایا مجھے
چلتے چلتے خار گل سے کیوں اٹک جاتا ہے یہ
قتل کرتا ہے مجھے آتا نہیں ہے دل میں رحم
ہوں کبھی اس شاخ پر میں اور کبھی اس شاخ پر

ہو گیا اقبال قیدی محفلِ گجرات کا

کام کرتے ہیں جہاں انسان بھی صیاد کا

یہ دونوں غزلیں مکمل طور پر میں نے اپنے اس خیال کی تائید میں درج کی ہیں کہ اقبال
کے بعد کے دور کا فکر و فن اقبال کے اس دور کی شاعری میں کبھی کبھی اپنی جھلک دکھاتا ہے
ہمیشہ نہیں۔ اور یہ دونوں غزلیں اس جھلک سے خالی ہیں جس سے یہ گمان ہو سکے کہ اس شاعر
کا کلام آئندہ چل کے ارتقار کی قابل ذکر منزلیں طے کرے گا۔

داغ کس دل بیتاب کی یارب تمنا شائی ہوئی

وہ نگاہ شوق کچھ پھرتی ہے گھبرائی ہوئی

اقبال

دل کو ذوق دید سے جس دم شناسائی ہوئی
سر کے بل راہِ مدینہ میں جو میں چلنے لگا
شوقِ گلزارِ مدینہ دل میں گھر کرنے لگا
خوابشِ جنت چھپی پھرتی ہے شرمائی ہوئی

چاک جب دستِ محبت نے کیا دامنِ سیم
حسنِ مخفی سے نگاہوں کو شناسائی ہوئی
میرے اندازِ تپیدن نے اُسے بہکا دیا
جانتی ہے موت اپنے آپ کو آئی ہوئی
ہو گئی شرحِ رموزِ اتحادِ حسن و عشق
تیری یکتائی ہی آخرِ میری یکتائی ہوئی
لوگ بدنامِ محبت کہتے ہیں اقبال کو
غازہٴ رخسارِ شہرت جس کی رسوائی ہوئی

داغ

غم سے کہیں نجات ملے چینِ پائیں ہم
دلِ خون میں نہانے تو گنگا نہانے ہم

اقبال

چاہیں اگر تو اپنا کرشمہ دکھائیں ہم
بن کر خیالِ غیر ترے دل میں آئیں ہم
اچھی کبھی شکایتِ جور و جفا کی بھی
اتنی سی بات کہے لیجئے محشر میں جائیں ہم
اے صدمہٴ فراق نہ کر ہم سے چھڑ چھاڑ
تو کس کا ناز ہے کہ تجھے ہوا اٹھائیں ہم
پوچھیں گے آج سرمہٴ دنبالہ دار سے
کس طرح سے کسی کی نظر میں سمائیں ہم

ہر چیز منع تو ہے ہمیں اے طیبِ عشق

لیکن بڑھے جو ضعف تو غش بھی نہ کھائیں ہم

یہ غزل جب مخزنِ (جنوری ۱۹۲۰ء) میں شائع ہوئی تو اس میں یہی پانچ شعر تھے جو ادھر پر
درج ہیں: بعد میں مندرجہ ذیل تین اشعار شیخ اعجاز احمد کے ذریعہ سے فقیر سید وجیہ الدین
نک پہنچے اور ان کی وساطت سے ہم آپ تک۔

دشمنِ شبِ فراق میں ہے اپنا آپ ہی
آجائے موت اپنی تو گنگا نہائیں ہم
ڈرتے تھے جس کے واسطے وہ بات اب کہا
تو ایک اب کہے تو تجھے سو سنائیں ہم

اقبال! شعر کے لیے فرصت ضرور ہے

اس فکرِ امتحان میں غزل کیا سنائیں ہم

یوں تو یہ داری غزلِ اقبال کے متردک کلام کا حصہ ہے لیکن غالباً پہلی منزل پر انھوں
نے یہی تین شعر حذف کیے ہوں گے۔ شاید اس وقت بھی انہیں پسند نہ آئے ہوں۔ بعد

میں جب ”بانگ درا“ زیر ترتیب تھی تو اُس وقت انھوں نے ساری غزل ہی کو نظر انداز کرنا مناسب سمجھا۔

دآغ

دھکیاں تو ہمیں وہ روزِ جزا دیتے ہیں
ہم درہائی تری یا بارِ خدا دیتے ہیں

اقبال

جان دے کر تمہیں جینے کی دعا دیتے ہیں
کوچہ یار میں ساتھ اپنے سلایا اُن کو
بدگمانی کی بھی کچھ حد ہے کہ ہم قاصد سے
رحم آتا ہے ہمیں قیس کی عسریانی پر
موت بازار میں بکتی ہے تولا دو مجھ کو
ایسی ذلت ہے مرے واسطے عزت سے سوا
غیر کہتے ہیں کہ یہ پھول گیا ہے مُردہ
موت بولی جو ہوا کوچہ قاتل میں گذر
اُن کو بے تاب کیا غیر کا گھر پھونک دیا
بھر بھی کہتے ہیں کہ عاشق ہمیں کیا دیتے ہیں
بختِ خفتہ کو مرے پاؤں دعا دیتے ہیں
قسمیں سولیتے ہیں جب ایک پتا دیتے ہیں
دھبیاں دامنِ صحر کی اڑا دیتے ہیں
ہم نشیں کس لیے جینے کی دعا دیتے ہیں
خود وہ اٹھ کر مجھے محفل سے اٹھا دیتے ہیں
قبر پر میری جو وہ پھول چڑھا دیتے ہیں
سراسی راہ میں مردانِ خدا دیتے ہیں
ہم دعائیں تجھے اے آہِ رسا دیتے ہیں

گرم ہم پر کبھی ہوتا ہے جو وہ بُتِ اقبال
حضرتِ دآغ کے اشعارِ سنا دیتے ہیں

دآغ

مڑے عشق کے کچھ وہی جانتے ہیں
کہ جو موت کو زندگی جانتے ہیں

اقبال

محبت کو دولت بڑی جانتے ہیں
نزلے ہیں اندازِ دنیا سے اپنے
اسے مایہِ زندگی جانتے ہیں
کہ تقلید کو خود کشی جانتے ہیں

یہ غزل کہہ کر جب اُمحیں سنائی تو بڑی تعریف کی۔ بعض بعض اشعار پر تو مجھ گلے سے لگالیا۔ میں نے اپنی غزل کا جب یہ شعر پڑھا:

دبروں پر طبیعت آتی ہے

اس طرح، اس قدر نہیں آتی

یہ شعر حضرت غالب نے کئی مرتبہ پڑھوایا اور بے حد پسند کیا۔ اس کے بعد جب اس شعر پر پہنچا:

دل کے لینے کی گھات ہے کچھ اور

یہ تجھے مفت بر نہیں آتی

تو غالب بے چین ہو گئے۔ زانو پر ہاتھ مار کر بولے ”خدا نظر بد سے بچائے صاحبزادے تم نے کمال کر دیا۔“ ہر دوسرے تیسرے روز غالب کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، مختلف باتیں ہوا کرتی تھیں۔ شطرنج بھی ہوتی تھی۔ میں جب ہار جاتا تھا تو مرزا صاحب فرماتے کہ اس جرمانے میں اپنی غزل سناؤ۔ ایک دفعہ شطرنج کی بازی ہارا، حسب معمول مرزا صاحب بولے کہ غزل سناؤ۔ میں غزل پڑھنا ہی چاہتا تھا کہ فرمایا کہ میری کہی ہوئی زمین ”ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے“ میں جو غزل تم نے کہی تھی، وہ سناؤ۔ میں نے تمہیں حکم کی میرے اس شعر پر:

اے فلک، سامانِ محشر ہی سہی

اپنی آنکھوں کو تماشا چاہیئے

مرزا غالب بولے، میرے خیال کی کتنی پیاری ترجمانی کی ہے، اور پھر اپنا شعر پڑھا:

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

نوحہ غم ہی سہی، نعمہ شادی نہ سہی

اس کے بعد میں نے یہ شعر پڑھا:

تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مسخر

دیکھنے والے کو دیکھا چاہیئے

کوئی قید سمجھے مگر ہم تو اے دل ! محبت کو آزاد کی جانتے ہیں
 حسینوں میں ہیں کچھ وہی ہوش و لے کہ جو حسن کو عارضی جانتے ہیں
 جو بے گلشن طور اے دل تجھے ہم
 اُسی باغ کی اک کلی جانتے ہیں

یہ اس غزل کی وہ صورت ہے جو ”مخزن“ جولائی ۱۹۱۱ء میں قارئین ”مخزن“
 کے سامنے آئی۔ اس غزل کے دوسرے شعر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ تقلید کو خود کشی
 سمجھنے والا مضمون اقبال کے احساس میں ایک مدت سے کروٹیں لے رہا تھا۔
 اس غزل کے دس شعر جو اقبال نے یہ غزل ”مخزن“ کو اشاعت کے لئے بھیجتے
 وقت نظر انداز کر دیئے تھے یہ ہیں۔

وہ کیا قدر جانیں گے میری وفا کی کہ ہوتے ہیں جو آدمی جانتے ہیں
 بُری چال ہوتی ہے بے اعتنائی یہی ہم تو اچھی بُری جانتے ہیں
 کیا ماجرا اُن کے گھر کا تو بولے قسم ہے تجھے ہم دلی جانتے ہیں
 بڑے شوخ و گستاخ ہیں زندہ باد مسلمان کو دوزخی جانتے ہیں
 تری چال دیکھی ہوئی ہے جنھوں نے قیامت کو اک دل لگی جانتے ہیں
 میں ہوں صاف گو، منہ نہ کھلوائیے گا تمہاری وفا کو سبھی جانتے ہیں
 گداگر ہو اور ہال ہوں اس کے لیے مسلمان اس کو ولی جانتے ہیں
 بدلتا پڑا ہنشیں ! نامہ بر کو اسے واں کے سب آدمی جانتے ہیں
 عجب زندگانی ہے اقبال اپنی نہ مر جانتے ہیں نہ جی جانتے ہیں

کہا میں نے اقبال کو جانتے ہو

تو بولے یہ ہنس کر کہ جی جانتے ہیں

اس غزل میں تین مقطع تھے۔ دو مقطع تو غزل کے مندرجہ بالا حصے میں آگئے ہیں ایک مقطع
 اور بھی ہے جو راقم التحریر نے مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کی بیاض میں سے نقل کیا تھا۔ یہ
 مقطع شورش کاشمیری کی بیاض میں بھی درج تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد مرحوم جب موڈ میں

ہوتے تھے تو یہ مقطع پڑھ کے زرد در قہقہہ لگایا کرتے تھے۔ اور کچھ تھے کہ حیرت ہے اقبال کی غزل کس ابتداء سے چل کے کس انتہا تک پہنچی اور وہ مقطع یہ ہے
 نئی ہو پرانی ہوا اقبال کو کیا
 یہ حضرت تو بس ایک پی جاتے ہیں
 مولانا صالح الدین احمد ”پی جاتے ہیں“ کو بار بار دہرایا کرتے تھے اور قہقہے پر قہقہے لگایا کرتے تھے۔

اب ان چند مثالوں کے بعد بعض نقاد حضرات کی یہ رائے راقم التحریر کے دل کو نہیں لگتی کہ اقبال کے یہاں داغ کے اثرات کو مطلق دخل نہیں ہے۔ داغ کا اثر اقبال کے کلام پر یقیناً ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ اثر غزل کے محدود انداز میں دیر پا نہیں رہا۔ لیکن اس کی ایک بنیادی حیثیت ضرور ہے اور اقبال کی بعد کی شاعری میں یہ کہیں نہ کہیں، تنہا ایک مصرع ہی میں سہی، اپنی جھلک دکھا جاتا ہے۔

خیر یہ تو تھی داغ کی زمینوں میں غزل کہنے کی بات۔ بعض دفعہ اقبال داغ سے یوں بھی متاثر ہوئے کہ ان کی زمین میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی مثلاً داغ کا ایک سہ غزل ہے۔ پہلی غزل کا مطلع یہ ہے۔

ہمیں کیا غم قیامت میں جو پرسش ہونے والی ہے
 کہ جب وہ فتنہ گر آیا تو پھر میدان خالی ہے
 دوسری غزل یوں شروع ہوتی ہے۔

یہاں شکوے پہ شکوہ ہے وہاں گالی پہ گالی ہے
 بہت کچھ ہوتی رہتی ہے بہت کچھ ہونے والی ہے
 تیسری غزل کا مطلع یہ ہے۔

غضب کے بانگین سے تیغ ظالم نے نکالی ہے
 جفا پیاروں کی پیاری ہے نرا لوں کی نرالی ہے
 اقبال نے قافیہ میں ذرا سا تصرف کیا اور یہ غزل کہی۔

لڑکپن کے ہیں دن صورت کسی کی بھولی بھولی
 تراے سیل دریا نے محبت منہ تلوں کب تک
 کوئی شوخی تو دیکھے جب ذرا درنا تھا میرا
 جفا جو کہہ دیا میں نے مگر تم نے بُرا مانا
 شبِ فرقت تصور تھا مرا، اعجاز تھا کیا تھا
 وہ میری جستجو میں پھر رہے ہیں خیر یارب
 تماشا کی کوئی آئینہ ہستی میں ہے اپنا
 سمجھ سکتا نہ تھا کوئی مجھے اس بزمِ ہستی میں
 جگت اشیر ہے تو ہر آتما کو پیت ہے تیری
 ہمیں یادِ وطن! کیا پیش آتا ہے خدا جانے
 تغیر روز کا کچھ دید کے قابل نہ تھا زکس!
 تبسم چاک جیبِ گل، تر تم ناہِ ملبسِ بل
 مہ و خورشید و انجم دوڑتے ہیں ساتھ ساتھ اک
 یہ ہوگی شوخ اے صناد! قدرت کی اسیری سے
 دیا عشق میں و اماندگی ز قمار ہے اے دل
 گماں تجھ پر ہوا تھا کیا دلِ بلبل کی چوری کا

زباں میٹھی ہے لب سنستے ہیں پیاری پیاری بولی ہے
 میری کشتی جو تھی آپ اپنے ہاتھوں سے ڈبولی ہے
 کہا ہے درد نے کیوں آپ نے مالا پر دلی ہے
 خفا کیوں ہو گئے یہ عاشقوں کی بولی ٹھولی ہے
 تری تصویر کو میں نے بلایا ہے تو بولی ہے
 پتا میرا بتانے کو قیامت ساتھ ہو لی ہے
 مزہ ہے حسن نے اے دل کتابِ عشق کھولی ہے
 گرہ تھی زندگی میری اجل نے آکے کھولی ہے
 صنم خانے کی یارب کیسی پیاری پیاری بولی ہے
 بھلا تو کس لئے غربت زدوں کے ساتھ ہوئی ہے
 بتا پھر کس کے نظارے کو تو نے آنکھ کھولی ہے
 یہ بے مہروں کی باتیں ہیں یہ بیدردوں کی بولی ہے
 فلک کیا ہے کسی معشوق بے پردا کی ڈولی ہے
 نیا قیدی ہوں میں آواز میری بھولی بھولی ہے
 جسے کہتے ہیں خاموشی وہ اس بستی کی بولی ہے
 صبا نے غنچہ گل! کیوں گرہ تیری ٹٹولی ہے

گلِ مضمون سے اے اقبال! یہ سہرا ہے ناصر کا

غزل میری نہیں ہے یہ کسی گلچیں کی جھولی ہے

(۱۹۰۳ء)

یہ غزل بھی ”مخزن“ میں شائع ہوئی تھی لیکن ایک شعر جو فقیر سید وحید الدین کے ذریعہ
 سے ہم تک پہنچا ہے اس غزل میں شامل نہیں ہے اور وہ شعر یہ ہے
 سنا ہے آج جنت میں بڑی رونق کا جلسہ ہے
 ترے کشتہ کا ہے نیلام اور حوروں کی بولی ہے

(۴)

اقبال مشقِ سخن کے بہت قائل تھے اور اس پر عمل پیرا بھی رہتے تھے۔ انھوں نے ایک ملاقات کے دوران میں میرے والد محترم مرحوم صاحب کو یہی مشورہ دیا تھا۔ جہاں تک داغ کی مشہور غزلوں کی زمینوں کا تعلق ہے اقبال نے محض مشقِ سخن کے لیے ان کے قافیہ یارِ دین میں تبدیلی کر کے غزلیں کہی ہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اقبال استاد کی زمینوں میں بھی ایک نیا پن پیدا کرنے کے آرزو مند رہتے تھے اور انھوں نے ان کی زمینوں میں ذرا سی تبدیلی کر کے غزل کہنے کی مشق جاری رکھی مثلاً داغ کی ایک زمین اور اس زمین میں اقبال کی غزل کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ داغ کے ایک مذکورہ سہ غزل کی زمین یہ ہے۔

اُن تری کا فوجوانی جوش پرائی ہوئی

اقبال کی اس زمین میں غزل پہلے درج ہو چکی ہے۔ لیکن اقبال نے پھر اس کی ردیفوں میں تبدیلی کی اور مندرجہ ذیل غزل کہی۔

عاشق دیدارِ محشر کا تمنائی ہو	وہ سمجھتے ہیں کہ جرم ناشکیبائی ہو
غیر سے غافل ہوا میں اے نمودِ حسن یار	عرصہٴ محشر میں پیدا گنجِ تنہائی ہو
میری مینائی ہی شاید مانعِ دیدار تھی	بند جب آنکھیں ہوئیں تیرا تماشا تھی ہو
ہائے میری بد نصیبی دائے ناکامی صری	پاؤں جب ٹوٹے تو شوقِ دشتِ پیمائی ہو
میں تو اس عاشق کے ذوقِ جستجو پر مر مٹا	منا عرفان کہہ کے جو تیرا تمنائی ہو
تجھ میں کیا اے عشق وہ اندازِ معشوقانہ تھا	حسنِ خود لولاک کہہ کر تیرا شیدا تھی ہو
دیکھ نادال امتیازِ شمع و پروانہ نہ کر	حسنِ بن کر عشقِ اپنا آپ سودائی ہو
اب مری شہرت کی سوچھی ہے انہیں دیکھ کوئی	پس کے میں جس دم غبارِ کوئے رسوائی ہو

بغضِ اصحابِ ثلاثہ سے نہیں اقبال کو

دق مگر اک خارجی سے آ کے مولائی ہو

یاد داغ کی ایک اور غزل ہے

نگاہِ پیر کے عذروِ سال کرتے ہیں مجھے وہ الٹی چھری سے حلال کرتے ہیں

اس کے قافیہ میں اقبال نے تبدیلی کی اور یہ غزل کبھی جو بانگ درا میں شریک اشاعت ہے۔

مثال پر تو مجھے طوف جام کرتے ہیں یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں
خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم اتری شجر حج بھی خدا سے کلام کرتے ہیں
نیا جہاں کوئی نے شمع اڑھونڈیہ کہہ رہا ستم کش تپشِ ناتمام کرتے ہیں
بھلی ہے ہم نفسو! اس چین میں خاموشی کہ خوشنواؤں کو پابند دام کرتے ہیں
غرض نشاط ہے شغل شراب سے جن کی حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں
بھلائی ہے گی تری ہم سے کیونکر اے داغ کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں
الہی سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیا راکِ نظر سے جوانوں کو رام کرتے ہیں
میں اُن کی محفلِ عشرت سے کانپ جانا پو جگھر کو چھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں
ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو! جہاز پر سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

داغ کی مشہور غزل ہے

بھویں تنہی ہیں خنجرِ ماہ تھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

اقبال نے اس غزل کی بھی ردیف میں تبدیلی کی۔ قافیہ وہی رکھا اور مندرجہ ذیل غزل
کہی جو اس وقت ان کے متروک کلام میں شامل ہے۔
جو مضمون میرے دل سے حرفِ نوزوں بن کے نکلے ہیں
وہی طائر بھی آخر گنبدِ مدفن کے نکلے ہیں

میری جہاں داستانِ میری کلیجہ تھام کر سننا
کہ میرے حال پر آنسو مرے دشمن کے نکلے ہیں

مسافر منچلے ہوتے ہیں کیا رامِ محبت کے
متاعِ دل کو لے کر واسطے رہزن کے نکلے ہیں

رفو اے بخیر گر چاکِ محبت ہو تو کیوں کمر ہو
مرے زخموں پہ آنسو دیدہ سوزن کے نکلے ہیں

پسند آئی نہ اُن کو سیرِ خلستانِ ایمن کی
مگر صحرائے شرب میں وہ کیا بن ٹھن کے نکلے ہیں

کبھی اس راہ سے شاید سواری تیری گزری ہے
کہ میرے دل میں نقشِ پا ترے تو سن کے نکلے ہیں

کرامت دیکھ اے دستِ جنوں، بادِ محبت کی
عرب میں جا کے پُرزے میرے پیراہن کے نکلے ہیں

گلستانِ جہاں میں مثلِ بلبل اُڑتے پھرتے ہیں
قلم سے شعر گویا میرے پر یاں بن کے نکلے ہیں

سبب اے ہم نشینو کچھ نہ پوچھو میرے رونے کا
یہ اداں ہیں کہ جو آنکھوں سے آنسو بن کے نکلے ہیں

نہ تڑپایا کسی کو تیرے نظارے کے اداں نے
کہ سارے دیکھنے والے تری چلن کے نکلے ہیں

کیا حیراں فرشتوں کو بھی تیرے درد مندوں نے
خدا جانے تری محفل سے یہ کیا بن کے نکلے ہیں

چلے جاتے ہیں سیدھے پھر ادھر کا رخ نہیں کرتے
جو مثلِ بونظارے چھوڑ کے گلشن کے نکلے ہیں

خدا جانے یہاں کی ہے ہوا وسعتِ فرا کیسی
تری درگاہ سے دُترے بیا باں بن کے نکلے ہیں

جو اپنی کشت زارِ دل کو میں نے اے فلک دیکھا
ستارے بھی ترے، دانے مرے خرمن کے نکلے ہیں

جنہوں نے مثلِ شبِ نیمِ اس چن میں آپ کو دیکھا
وہی عاشق کسی کے چہرہ روشن کے نکلے ہیں

تماشا کی جو وسعت میں نے اپنے دامنِ دل کی
ہزاروں دشتِ اس گوشے میں اک دامن کے نکلے ہیں

برہنِ روزِ محشر ڈھونڈت پھرتا ہے واعظ کو
اصنم جو تھے وہ پتھر وادیِ امین کے نکلے ہیں

وہ مذبحِ ازل ہوں میں کہ خنجر سب حسینوں کے
پرانے آشنا میری رگ گردن کے نکلے ہیں

اٹھارہ اشعار کی یہ غزل ”روزگارِ فقیر“ جلد دوم میں شامل ہے لیکن اس غزل کے
دو شعر دو اور کتابوں میں موجود ہیں اور وہ ہیں ”رختِ سفر“ اور ”سردِ رفتہ“۔ اول الذکر
کتاب میں یہ شعر درج ہے۔

تعلق پھول ہیں گویا ریاضِ آفرینش کے
مگر دیکھا تو کانٹے بھی یہی دامن کے نکلے ہیں

اور ثانی الذکر میں یہ شعر

مجھے اقبال اس ستیر کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

(۵)

اب داغ کی ایک اور زمین میں غزل کہنے والے اقبال کی اپنی نمایاں جھلک دیکھیے۔
داغ کی غزل ہے۔

ہائے مہمان کہاں یہ غمِ جاناں ہوگا
آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں
نمائے دل تو کوئی روز میں دیراں ہوگا
آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا
اقبال کہتے ہیں

لاکھ سرتاجِ سخنِ ناظمِ شہ وائ ہوگا
پر مرے سامنے اک طفلِ دبستاں ہوگا

عشق کی راہ میں جو کوئی قدم رکھے گا
 کبھی گریاں کبھی خنداں کبھی عریاں ہوگا
 کیا کہیں مست مئے عشق کہاں ہو قلم ہے
 بہ درِ دیرِ فغاں ناصیہ کو یاں ہوگا
 جیتے جی سرنہ جھکائیں گے کسی کے آگے
 مجھ پہ احسان نہ ہوگا تو یہ احساں ہوگا
 زندگی چار دہاڑے ہے تو اس کی غلط
 بوالہوس ہوگا جو شرمندہ احساں ہوگا

چار سو پھولوں کا انبار نظر آتا ہے

شاید اس بزم میں اقبال غزل خواں ہوگا

اور وہ جو میں نے چند سطور قبل یہ عرض کیا ہے کہ داغ کے اندازِ بیان میں غزل کہنے کے
 باوجود اقبال کا اپنا رنگِ طبیعت کبھی کبھی اس اندازِ بیان پر شبِ خون مارتا رہتا تو اس کی مثال
 کے طور پر اسی غزل کے دو اشعار پیش کر رہا ہوں۔

جو وفا پیشہ سمجھتا ہے خودی کو ایماں
 جنتی ہوگا فرشتوں میں نمایاں ہوگا
 مردِ مومن کی نشانی کوئی مجھ سے پوچھے
 موت جب آئے گی اس کو تو وہ خداں ہوگا
 یہ ۱۹۰۲ء کے اشعار ہیں اور مندرجہ ذیل رُباعی تو اقبال نے بہت بعد میں آکے کہی۔
 سحرِ بادِ گرینِ بانِ شبِ اوست
 دو گیتی را فرِ دغ از کوکبِ اوست
 نشانِ مردِ حقِ دیگر چہ گویم
 چو مرگ آید تبسمِ بربِ اوست
 یہ ارمغانِ جواز کی رُباعی ہے جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی لیکن مذکورہ شعر
 مردِ مومن کی نشانی کوئی مجھ سے پوچھے
 موت جب آئے گی اس کو تو وہ خداں ہوگا

۱۹۰۲ء کا ہے۔ اور خودی کا تصور بھی باضابطہ صورت میں اقبال نے ۱۹۰۲ء میں کہاں پیش
 کیا تھا۔ بانگِ درا کا ابتدائی حصہ اس موضوع سے خالی ہے اور ”اسرارِ خودی“ ۱۹۱۵ء
 میں چھپی۔

(۶)

یہاں اپنی اس بات کو قدرے تقویت دینے کے لئے کہ داغ کی انگلی پکڑ کر چلتے چلتے
 اقبال اس انگلی کو چھوڑ کر تنہا بھی اپنی رفتار سے چلنے کے لئے بیتاب ہو جاتے ہیں یہیں داغ

کی ایک اور غزل کا ذکر نا ضروری سمجھتا ہوں۔ داغ کہتے ہیں
 کئی دن سے خوشامد کر رہا ہے آسماں میری
 الہی دل ہی دل میں گھٹ کے رہ جائے فغاں میری
 اقبال نے اس زمین میں غزل نہیں کہی بلکہ اس زمین میں انھوں نے اپنی نظم ”تصویر درد“
 کی ابتدا کی۔

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
 خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری
 اقبال کی یہ نظم ۱۹۲۲ء کی ہے جب کہ اقبال ابھی یورپ روانہ نہیں ہوئے تھے۔ داغ
 مرحوم زندہ تھے اور اقبال ان سے اصلاح لے رہے تھے اور یہیں سے اقبال کے اس TENSION
 کی ابتدا ہوتی ہے جو لندن پہنچ کے اس مبینہ خیال پر منتج ہوا کہ اب مجھے شاعری ترک کر کے کوئی ایسا کام کرنا چاہئے
 جو ملک و قوم کے لیے مفید ہو لیکن لندن کے اس واقعہ کا ذکر سیاق و سباق کے ساتھ ذرا بعد میں آئے گا۔
 نہ کو رہ نظم ”تصویر درد“ میں ایک شعر ہے

اڑالی قریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
 چن والوں نے مل کر لوٹ لی طرہ فغاں میری

داغ کی غزل میں ایک شعر آتا ہے
 گئے تھے سیر کو گلشن کی دونوں ٹٹ کے آئے ہیں
 ادا ان کی اڑائی گل نے بلبل نے فغاں میری
 ”تصویر درد“ کی تاریخ کا ذکر میں نے اس لئے کیا ہے کہ داغ کی بعض زمینوں میں
 اقبال نے بہت بعد میں بھی شعر کہے ہیں لیکن ان پر رنگ داغ کا اثر نظر نہیں آتا مثلاً داغ کی
 یہ غزل دیکھئے۔

کچھ اس کو وہم کچھ اس کو غرور رہتا ہے
 الگ تھلگ وہ بہت دور دور رہتا ہے

اور اقبال کا بہت بعد کا ایک قطعہ ہے

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے
اگر ہوزندہ تو دل نا صبور رہتا ہے
فرشتہ موت کا چھوٹا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکنے سے دور رہتا ہے

اس مقالے میں اقبال کے اس طرح کے کلام کو جو داغ کی زمینوں میں ہے لیکن ۱۹۰۸ء کے بعد کا ہے موضوع بحث نہیں بنایا گیا لیکن ۱۹۰۸ء کی تصویر در دکا ذکر اس لیے خاص طور سے کیا گیا ہے کہ ۱۹۰۸ء، ۱۹۵۰ء اور ۱۹۷۰ء اقبال کی شاعری میں ایک معنی خیز موڑ کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن اس موڑ کا بالتفصیل ذکر کرنے سے پہلے داغ کی شاعری کے متعلق دو ایک باتیں عرض کرنا ضروری ہے جن کا ذکر اس مقالے میں ذرا پہلے ہونا چاہیے تھا۔

احسن مارہروی داغ کے دیوان چہارم ”یادگار داغ“ کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔
”کوئی صاحب ان کی شاعری کو عیاشانہ شاعری فرماتے ہیں، کوئی سوقیانہ، کوئی جاہلانہ حالانکہ ان کی اور صرف ان کی وہ شاعری ہے جو زمانے کے حسب حال اور موجودہ طبائع کا فوٹو ہے؟ یہاں احسن مارہروی کے تبصرے پر بحث مقصود نہیں ہے لیکن اتنا کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ داغ کی شاعری کو صرف کھل کھیلنے کی شاعری یا عیاشانہ شاعری یا سوقیانہ شاعری کہہ کے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ داغ کی نظر میں وہ اجتماعی زندگی نہیں تھی جو اس وقت اکبر الہ آبادی اور حاکی کی شاعری کا طرہٴ اقتیاز تھی لیکن داغ نے اپنی شاعری کا جو رخ پیش کیا وہ کوئی زندگی سے کٹا ہوا پہلو نہیں ہے۔ یہ اس زندگی کا رخ ہے جو صرف داغ ہی بسر نہیں کر رہے تھے بلکہ ہمارے معاشرے کا جزو بن چکی تھی۔ ہمارے ایک نقاد لکھتے ہیں کہ ”غور و فکر سے تو انہوں (داغ) نے کبھی کام ہی نہیں لیا اس لیے ان کے یہاں تفکر اور فکر کے رونما ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا“ راقم التحریر کے نزدیک یہ رائے تضاد بیانی کا شکار ہے۔ شاعری میں غور و فکر سے کام نہ لینا بالکل دوسری بات ہے اور فکرانہ یا فلسفیانہ مضامین باندھنا دوسری بات۔ اور اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ داغ نے کبھی غور و فکر سے کام نہیں لیا اور ان کی شاعری کو ہم صرف عیاشانہ یا ہوسناکی اور زندگی کے موضوعات

شعر سن کر مرزا غالب اُف کر کے رہ گئے۔ میں نے فوراً یہ دوسرا شعر پڑھا:

گو تری نظروں سے کل گر ہی پڑیں

آج تو کوئی ٹھکانا چاہیے

میرے اس شعر پر غالب تڑپ گئے۔ بوئے بھیر زمین پر ہاتھ ٹیک کر اُٹھے۔ میرے گرد چادر پانچ بار گھومے۔ گھومنے کی حالت میں نہایت دردناک آوازیں میرا یہ شعر پڑھتے جاتے تھے۔“

یوں تو ہر مشاعرے میں داغ کو دادِ سخن ملتی، لیکن داغ کے لیے اس سے بڑا اور اعزاز کیا ہو سکتا تھا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب، صدر الصدور مفتی صدر الدین خاں اور مولوی امام بخش صہبائی جیسے لوگ اُن کے مداحوں میں تھے اور کلام کی داد دے کر اُن کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

مختلف فنون میں داغ کی تربیت تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ تقریباً پچیس سال عمر تھی کہ اچانک ۱۰ جولائی ۱۸۵۷ء کو مرزا فخر کو بیضہ ہوا اور چند گھنٹوں میں انتقال ہو گیا۔ داغ اور ان کی والدہ چھوٹی بیگم کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ مرزا فخر کے دم سے یہ دونوں قلعے میں تھے۔ اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی یہ دونوں قلعہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

کچھ عرصے بعد چھوٹی بیگم ایک انگریز ماسٹرن بلاک کے ساتھ رہنے لگیں۔ مالکِ راجا کا بیان ہے کہ یہ نام بلیک مارٹن یا مارٹن بلیک ہے۔ کہتے ہیں کہ بلاک کے بعد کسی دکنی سے بھی ان کا تعلق رہا داغ کے سوانح نگار یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ ان تمام لوگوں کے ساتھ چھوٹی بیگم رہی تھیں۔ لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ سب سے پہلے بلاک پھر نواب شمس الدین پھر آغا تراب علی اور سب سے آخر میں مرزا فخر کے ساتھ رہی تھیں۔ مالکِ رام صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے لوہارو خاندان میں نواب ضیاء الدین خاں نسیر خشاں اور چھوٹی بیگم کی ایک ساتھ کبھی ہوئی تصویر دیکھی تھی۔ چار پانچ سال پہلے جب نواب امین الدین احمد خاں ثانی ہماچل پردیش کے گورنر تھے تو شملے میں اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کے خاندان میں ایک نیکلس تھا۔ جس میں چھوٹی بیگم کی تصویر تھی۔ خاندانی

ہی میں مقید کر لیتے ہیں تو اُن کے یہ اشعار کس موضوع کی شاعری کے تحت آئیں گے۔

اے داغ کسی طرح سے یہ کم نہیں ہوتی

انسان کو برباد کیا حرص و ہوانے

میں وضع کا پابند ہوں مگر جان بھی جائے جب کوئی بلانے نہیں آتا نہیں جاتا

دینے کا بات کم نہیں لینے کے ہاتھ سے

بڑھتا ہے دست جو دہی سائل کے سا

اب گردشِ فلک کا طریقہ ہی اور ہے آنکھیں کھلیں زمانے کی رفتار دیکھ کر

فلک دیتا ہے جن کو عیش اُن کو غم بھی ہوتے ہیں

جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

اے بے خودی شوق ہماری ہے یہ سستی دنیا میں ہیں اس طرح کہ دنیا میں نہیں ہیں

ذرا اپنے گریباں میں تو وہ منہ ڈال کر دیکھیں ہوئے ہیں دوسروں کی جو بُرائی دیکھنے والے

حسد سے نکلتے ہیں یا عیب ہیں غیروں کے ہوتے ہیں بہت کم دیکھے آپ اپنی بُرائی دیکھنے والے

اللہ رے کشاکشِ دیرو و حرم کہ میں ظالم ہزار ہاتھ سے دامن دریدہ ہوں

داغ سا بھی کوئی شاعر ہے ذرا سچ کہنا

جس کے ہر شعر میں ترکیب نئی، بات نئی

مر گئے خسرو و جمشید سے میکش لاکھوں رونقِ ساغر و آرائشِ محفل ہے وہی

جو کہے داغ سیہ مست وہ لکھ لودل پر اس خرابات میں اک مرشدِ کامل ہے وہی

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو

کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

یہ ہوسنا کی اور رندی کی شاعری نہیں ہے اس لیے اقبال پر داغ کے اثرات ڈھونڈنے

کے لیے ہمیں کلامِ داغ کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا ہو گا۔ اقبال کو کلامِ داغ میں رندی اور

ہوسنا کی یا کھل کھیلنے والی شاعری کے علاوہ اور بھی کچھ نظر آیا ہو گا، حمد اور نعت بھی،

اخلاقیات کے مضامین بھی اور اُردو زباں آتے آتے والی یا ہندوستان میں دھوم ہماری

زبان کی ہے والہامات بھی۔

(۸)

۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۴ء تک کی جس مدت میں اقبال اپنی وہ غزلیں کہہ رہے تھے جن کا ذکر سطور بالا میں تفصیل سے آیا ہے اسی زمانے میں اقبال نے اپنی مندرجہ ذیل نظمیں بھی کہیں۔
نالہ یتیم، ایک یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے، ہمالہ، گل رنگیں، عہدِ طفلی، مرزا غالب، ابر کو ہزار
خفتگانِ خاک سے استفسار، اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب سے، شمع و پروانہ، عقل و دل،
صدائے درد، آفتاب، شمع، ایک آرزو، آفتابِ صبح، دردِ عشق، گل پڑ مردہ، سید کی
لوحِ تربت، ماہِ نو، انسان اور بزمِ قدرت، پیامِ صبح، عشق اور موت، نہ ہوا اور نندی،
شاعر، فریادِ اُمت، موجِ دریا، رخصت اے بزمِ جہاں، طفلِ شیر خوار، تصویرِ درد، نالہِ فراق،
چاند، ہلال، سرگزشتِ آدم، ترانہ ہندی، جگنو، صبح کا ستارہ، نیا شوالہ، دآغ، ابر، ایک
پرندہ اور جگنو، بچہ اور شمع، کنارِ راوی، التجائے مسافر، برگِ گل، نعت، معراج، جوہرِ ایمان،
خطاب بہ مسلم، شیشہ ساعت کی ریگ وغیرہ۔ ان نظموں میں دآغ کا اثر دور دور تک نظر
نہیں آتا۔ غالباً اس وقت تک اقبال بطور شاعر کے دو حصوں میں منقسم تھے۔ ایک غزل
کا شاعر اور ایک نظم کا شاعر۔ دراصل اقبال نے جب شاعری کی ابتدا کی تو وہ دورِ اریا
ہی تھا کہ اساندرہ کی زمینوں میں غزل کہنا کمالِ فن سمجھا جاتا تھا۔ اقبال بھی اسی روش پر
چل تو پڑے لیکن اس روش سے اطمینان نہ پاسکے۔ یہ ایک تقلید کی روشنی تھی جو اقبال
کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ ان کا یہ مصرع جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے اسی زمانے
کا ہے۔ تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خود کشی۔ وہ نئے رستوں کی تلاش میں تھے لیکن
خضریٰ رہنمائی انھیں گوارا نہیں تھی۔ وہ اپنی راہ سفر کو اپنی ہی تجلّی سے روشن دیکھنا چاہتے
تھے۔ خدا جانے اس سوچ بچار کے دور میں وہ کس ذہنی کشمکش اور عالمِ کرب سے گزرے
ہوں گے۔ راقم التحریر نے لندن کے جس واقعہ کا ذکر سطور بالا میں کیا ہے وہ شیخ سر عبد القادر
کی زبان سے مٹینے: ”ایک دن شیخ محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ اُن کا ارادہ مصمم ہو گیا
ہے کہ وہ شاعری کو ترک کر دیں اور قسم کھالیں کہ شعر نہیں کہیں گے اور جو وقت شاعری میں

صرف ہوتا ہے اُسے کسی اور مفید کام میں صرف کریں گے۔ میں نے اُن سے کہا کہ اُن کی شاعری ایسی شاعری نہیں ہے جسے ترک کرنا چاہیے۔ بلکہ اُن کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے اس لیے ایسی مفید خداداد طاقت کو بیکار کرنا درست نہ ہوگا۔ شیخ صاحب کچھ تامل ہوئے، کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے۔ اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو شیخ صاحب اپنے ارادہ ترک شعر کو بدل دیں اور اگر وہ شیخ صاحب سے اتفاق کریں تو ترک شعر اختیار کیا جائے میں سمجھتا ہوں کہ علمی دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق رائے کیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ اقبال کے لئے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں اور جو وقت وہ اس شغل کی نذر کرتے ہیں وہ ان کے لیے بھی مفید ہے اور ان کے ملک و قوم کے لیے بھی مفید ہے۔

اس عبارت سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر پروفیسر آرنلڈ آڑے نہ آتے تو اُمیدو ادب اقبال کی ۱۹۰۵ء کے بعد کی شاعری سے محروم رہ جاتا اور اقبال شعر کہنے کے عوض کسی اور ”مفید کام“ میں مصروف ہوتے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شاعری ایک ارادی فعل ہے، اور پھر اقبال ایسے شاعر کی شاعری۔ اس ضمن میں میری ناقص رائے یہ ہے کہ جسے شیخ صاحب نے اقبال کا مصمم ارادہ کہا ہے وہ مصمم ارادہ نہیں ہوگا۔ وہ محض ایک وقتی کیفیت ہوگی۔ اقبال اس وقت در راہ پر تھے۔ وہ اپنی شاعری کے اُس پہلو سے بیزار ہو رہے تھے جس میں فکری اعتبار سے، ساختی اعتبار سے اور موضوعی اعتبار سے داغ کی تقلید موجود ہے۔ لیکن داغ سے عقیدت انھیں اُس شاعری سے دامن چھڑانے بھی نہیں دیتی تھی۔ یوں تو شیخ عبدالقادر نے بھی اقبال سے کہا کہ ”ان کے کلام میں وہ تاثیر موجود ہے جس سے ممکن ہے ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے“ اور آرنلڈ نے بھی یہی کہا کہ اقبال کے لئے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں اور جو وقت وہ اس شغل کی نذر کرتے ہیں وہ ان کے لیے بھی مفید ہے اور ان کے ملک و قوم کے لیے بھی۔ لیکن کیا اقبال اس حقیقت سے واقعی بے خبر تھے اور اسی بے خبری کے عالم میں انھوں نے ترک شعر کا مصمم ارادہ کر لیا تھا؟ کیا انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ جس غزل کے مقطع میں انھوں نے کہا۔

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے

کہ کام جو کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

اس کے تمام اشعارِ دماغ کے اسلوبِ سخن، طریقِ اظہار و ابلاغ یا اندازِ بیان سے

بالکل آزاد ہیں اور وہ اشعار یہ ہیں۔

اسے ہے سودائے بخیہ کاری مجھے سر پرین نہیں ہے

مثالِ شمعِ مزار ہے تو تری کوئی انجمن نہیں ہے

وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے جو زیرِ چرخِ کھن نہیں ہے

بنا ہمارے حصّہ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

الہی عقلِ نجستہ بے کوزا سی دیوانگی سکھادے

ملا محبت کا سوز مجھ کو تو بولے صبحِ ازل فرشتے

یہاں کہاں ہم نفسِ میسر یہ دیں نا آشنا ہے اے دل

نرالا سارے جہاں سے اس کو عربکِ معارف نے بنایا

کہاں کا آنا کہاں کا جانا، فریب ہے امتیازِ عقبیٰ

نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں بہارِ وطن نہیں ہے

یہ قیامِ یورپ کی غزل ہے لیکن اقبال کے یہاں نظریاتی شاعری کی ابتدا اس سے پہلے

ہو چکی تھی۔ نظم میں تو خیر مثالیں دینے کی ضرورت ہی نہیں غزل میں بھی اقبال کا یہ اندازِ فکر

کہیں نمایاں اور کہیں غیر نمایاں طریقے پر اپنی چمک دکھا جاتا ہے۔ مثلاً۔

اس چین میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت آہ یہ گلشن نہیں ایسے ترانے کے لیے

جس ہوں نالہ ہے خوابیدہ میرے ہر گونگے یہ خاموشی مری وقتِ رحیل کا رواں تک ہے

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستان سے لے اقبال

اڑا سکے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

اور پھر وہ غزل آتی ہے جس میں اقبال کے یہ اشعار پرانی طرز کی غزل گوئی سے بیزاری اور

نئے رستے کے تجسس کی نشاندہی کرتے ہیں۔

رستہ بھی ڈھونڈِ حُضُر کا سودا بھی چھوڑ دے

بیگانہ شے پہ نازشیں بے جا بھی چھوڑ دے

بُت خانہ بھی، حرم بھی، کلیسا بھی چھوڑ دے

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خود کشی

مانندِ خامہ تیری زباں پر ہے حرفِ غیر

ہے عاشقی میں رسمِ الگ سب سے بیٹھنا

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسِ بانِ عقل

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے
اگرچہ کسی ایک غزل یا دو غزلوں کو کسی بھی شاعر کے فکری موڑ کا سنگ میل قرار دینا
آسان بھی نہیں اور تنقیدی تقاضوں کو پورا بھی نہیں کرتا لیکن ۱۹۰۵ء کی مذکورہ بالا غزل اور شتہ
کی وہ غزل جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

ملاحظت کا سوز مجھ کو تو بولے صبح ازل فرشتے
مثال شمع مزار ہے تو تری کوئی انجن نہیں ہے
در اصل اس احساس محرومی اور اس سے پیدا ہونے والی ٹرپ کا اظہار میں کہ میری
غزل ابھی تک اجتماعی زندگی کے عرفان سے بیگانہ ہے۔ میں جس رستے پر گامزن ہوں یہ
رسمی اور روایتی غزل کا رستہ ہے۔ اگرچہ وہ اس حقیقت سے بھی نا آشنا نہیں تھے کہ داغ
نے انھیں کلاسیکی شعری روایت میں رچے بسے اسلوب سے پوری طرح آگاہ کر دیا ہے اور
بقول سید عابد علی عابد ”رولیت کا طالب علم داغ کے کلام میں شعری علامت و رموز کی آخری
ارتقاء یافتہ شکل دیکھ سکتا ہے“

اب اس مذکورہ غزل کے بعد کی غزل دیکھئے۔
زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا
مری خوشی نہیں ہے گویا مزار ہے حرف آرزو کا
فتح محمد ملک نے اقبال کی اس غزل کو اقبال کی نئی شاعری کا منشور کہا ہے اور یہی وہ
غزل ہے جس میں اقبال روایتی ادب سے اور اس غزل سے جو وہ داغ کے زیر اثر کہتے
رہے ہیں بیزاری کا پھر ایک بار اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

گیا ہے تقلید کا زمانہ مجاز رخت سفر اٹھائے
ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یا راہے گفتگو کا
”بانگ درا“ کے اسی حصے (دشہ سے ۱۹۰۸ء تک) میں ایک غزل پر اقبال نے
خاص طور سے تاریخ درج کی ہے۔ مارچ ۱۹۰۷ء۔ اس غزل کا مطلع ہے۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار ہو گا
 سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا
 ظاہر ہے کہ پرانی اصطلاحیں استعمال کر کے بھی اقبال رمزدیما کے پردے میں سیاسی
 طور پر بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ یہ اشعار اسی غزل میں آتے ہیں۔
 دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دُکاں نہیں ہے
 کھر ا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زبرِ کم عیار ہو گا
 تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشتی کرے گی
 جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہو گا
 نکل کے صحرا سے جس نے روم کی سلطنت کو پلٹ دیا تھا
 سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا
 میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درمائدہ کار وداں کو
 شرفشاں ہو گی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہو گا
 گویا دس بارہ برس تک داغ کے اثرات پوری طرح قبول کرنے کے بعد اقبال
 اب ان اثرات سے شعوری طور پر پوری طرح آزاد ہو چکے تھے۔
 داغ کا انتقال ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ ہمیں اس بات سے خالی الذہن نہیں ہونا چاہیے
 کہ یہ وہ وقت تھا جب اقبال اپنی غزل میں انقلابی تبدیلیوں کی دہلیز پر کھڑے تھے لیکن
 اُستاد کی موت ایک ایسے شاگرد کے لیے جس کے دل میں اُستاد کی محبت اور عقیدت
 کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہو ایک طوفانِ غم سے کم نہیں۔ چنانچہ اس غم و اندوہ کی انتہائی
 شدت کے عالم میں انھوں نے داغ کا مرثیہ کہا جس نے شخصی مرثیے کی صنف میں ایک نئے
 دور کا اضافہ کیا۔

اس مرثیے میں اقبال جو ش عقیدت میں یہاں تک کہہ گئے۔

جو ہر معجزہ نائی پا چکا جس دم کمال
 پھر نہ ہو سکتی تھی پیدا میر و مرزا کی مثال
 کر دیا قدرت نے پیدا ایک دونوں کا نظیر
 داغ یعنی وصلِ فکرِ میرزا و دردِ میر

لیکن جب اس نظم کو ”بانگ درا“ میں شامل کرنے کا وقت آیا اور اقبال نے اس نظم میں مندرج خیالات پر غور کیا تو غالباً اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ یہ دو شعر محض میری عقیدت کا نتیجہ ہیں اور ان میں مبالغے کا وہی عیب موجود ہے جسے ”غلو“ کہتے ہیں اور جو داغ کی شاعری کا طرہ امتیاز سہی لیکن اقبال کی شاعری میں حلقہ بیردن در کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ اقبال کو اس حقیقت تک پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ داغ کا کلام میرزا غالب کی فکر اور میر تقی میر کے در و گداز کا مقام اتصال نہیں ہے۔ نہ تو داغ میں پر مرغ تخیل کی رسائی ہے اور نہ ہی میر تقی میر والی کیفیت گداز ہے۔ اس لیے انھوں نے یہ دونوں شعر اپنی نظم سے خارج کر دیے۔ صرف یہی نہیں کہ کلام داغ کے محاسن کا ذکر کرتے ہوئے وہ بنیادی طور پر دوسرے شعراء کے محاسن کلام بیان کرتے ہیں جن سے داغ کا کلام خالی ہے مثلاً کہتے ہیں۔

اور دکھلائیں گے مضمون کی ہمیں باریکیاں اپنے فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں
تلخیِ دوراں کے نقشے کھینچ کر رُلوائیں گے یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبل شیراز بھی

سینکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی

گویا داغ کے کلام میں مضمون کی باریکیاں بھی مفقود ہیں، فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں بھی نہیں ہیں، تلخیِ دوراں کے نقشوں اور تخیل کی نئی دنیاؤں سے بھی کلام داغ خالی ہے اور بلبل شیراز والی بات بھی نہیں ہے۔ اور تان یہاں آکر ٹوٹتی ہے۔

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون

اٹھ گیانا دوک فلن مارے گا دل پر تیر کون

گویا واضح لفظوں میں داغ کا کمال فن اقبال کے نزدیک عشق کی تصویر کھینچنا ہے اور یہ عشقِ رومی والا عشق یا وہ عشق نہیں ہے جسے بعد میں اقبال کے نظریہ عشق کی تفسیر بنا تھا بلکہ جنسی عشق ہے اور وہ بھی طوائفوں یا آبرو باختہ عورتوں کے ساتھ والا عشق اسی نظم کے متروک اشعار میں ایک شعر یہ بھی ہے۔

کم نہیں محشر سے کچھ ایسی صدائے ناشی آہ! دلسوزی تو تھی گو نکتہ آموزی نہ تھی

تو اس تجزیے کے بعد اقبال کہاں تک داغ کے رنگ سخن سے چپٹے رہتے۔
 آخر میں داغ کے اقبال پر اثرات کے بارے میں ایک بات اور بھی عرض کر دینا ضروری
 معلوم ہوتا ہے۔ اس مقالے میں اُستادِ محترم سید عابد علی عابد کی اس رائے کا حوالہ دیا جا
 چکا ہے کہ ”روایت کا طالب علم داغ کے کلام میں شعری علامت و رموز کی آخری ارتقاء یافتہ
 شکل دیکھ سکتا ہے۔“ سید عابد علی عابد کی پوری عبارت یہ ہے:۔ ”غزل کی شعری روایت
 جس میں دلی سے لے کر تیر تک اور تیر سے لے کر غالب تک ترمیم و تغیر ہونا رہا تھا داغ
 کے زمانے تک پہنچ کر گویا سنگ بستہ اور ساکن ہو گئی۔ اس سے شعری روایت کو نقصان
 ضرور پہنچا کہ آگے بڑھنے کے امکانات نہیں رہے لیکن یہ فائدہ بھی پہنچا کہ روایت کا طالب علم
 داغ کے کلام میں شعری علامت و رموز کی آخری ارتقاء یافتہ شکل دیکھ سکتا ہے۔“

یہ خاکسار اُستادِ محترم کی گراں قدر رائے کے اس حصے سے متفق نہیں ہے کہ آگے
 بڑھنے کے امکانات نہیں رہے تھے۔ اسے اس ضمن میں یہ عرض کرنا ہے کہ جہاں تک اقبال
 کے علاوہ داغ کے باقی شاگردوں کا تعلق ہے مذکورہ شعری خصوصیات کی ترقی کے امکانات واقعی ختم ہو چکے
 تھے کیونکہ ان شعرا نے اپنی غزل میں رموز و علامت، تشبیہ و استعارہ اور ضائع بدائع ہی کو مقصود بالذات سمجھا
 لیکن اقبال نے ان خصائص شعری کو مقصود بالذات نہیں سمجھا بلکہ شاعری کے حسن میں اضافہ کرنے کا اردو شاعری کا
 مرتبہ بلند کرنے کا ایک وسیلہ سمجھا اس لیے اقبال کے یہاں ان خصوصیات کے بہتر استعمال کے امکانات ختم نہیں ہوئے
 اس میں شک نہیں کہ اپنی اس بحث کے دوران میں اُستادِ محترم نے اُس نئی معنویت
 کی جانب اشارہ کیا ہے جو اقبال نے ان رموز و علامت کو بخشی لیکن انھوں نے اس
 معنویت کو اقبال کے سیاسی، ملی اور فلسفیانہ افکار کے ابلاغ و اظہار تک محدود
 رکھا ہے۔

اقبال کی ان غزلوں میں جو قریب قریب سو فی صد داغ کے رنگ میں کہی گئی
 ہیں اور جن میں (دو تین کو چھوڑ کر) اقبال نے اپنے کلام سے خارج کر دیا۔ واقعی مذکورہ خصوصیات
 شعری کے حسن میں اضافے کا امکان ہر اعتبار سے ختم ہو چکا تھا لیکن ان غزلوں کے بعد اقبال
 کی غزل کا ایک اور دور آتا ہے۔ یہ بھی ۱۹۰۵ء سے پہلے ہی کی غزلیں ہیں مثلاً۔

لاؤں وہ تنکے کہاں سے آشیانے کے لیے
 کیا کہوں اپنے چین سے میں جد کیوں کر ہوا
 انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
 ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
 کہوں کیا آرزوئے بید ملی مجھ کو کہاں تک ہے
 جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
 کشادہ دست کرم جب وہ بے نیاز کرے
 سختیاں کرتا ہوں دل پر غیر سے غافل ہوں میں
 مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے

یہ وہ غزلیں ہیں جن میں داغ ہی کے رموز و علائم کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ غزلیں سب کی سب، تین چار اشعار کو چھوڑ کر جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے غم جاناں اور غم ذات کے گرد گھومتی ہیں۔ ان میں ماورائیت اور تصوف کے مضامین بھی ہیں (اجتماعی شعور کی بوجاس ان میں نظر نہیں آتی)، لیکن یہ غزلیں اثرات داغ کی دین ہونے کے باوجود داغ کی غزلوں سے بہت مختلف ہیں۔ ان کی زبان و بیان، ان کا قالب و لہجہ، ان کا اسلوب داغ کا قالب و لہجہ یا داغ کا اسلوب نہیں ہے میری ناقص رائے میں یہ اقبال کی غزل کا عبوری دور ہے۔ انور سدید اور فتح محمد ملک نے اقبال کی ان غزلوں کو عبوری دور کی غزلیں کہا ہے جو ہر اعتبار سے یا قریب قریب ہر اعتبار سے داغ کے رنگ میں ہیں اور جن کی مثالیں اس مقالے کے شروع میں دی جا چکی ہیں مثلاً ”دوپٹہ سنبھال کے“ یا ”غش بھی نہ کھاتیں ہم“ وغیرہ۔ راقم التحریر کے نزدیک یہ دور اقبال کی غزل کا عبوری دور نہیں ہے۔ یہ بالکل ابتدائی دور ہے۔ عبوری دور وہ ہے جس میں اقبال نے مذکورہ غزلیں کہیں جن کے چند اشعار یہ ہیں :-

تو نے دیکھا ہے کبھی اے دیدہ عبرت کہ گل

ہو کے پید ا خاک سے رنگیں قبا کیونکر ہوا

رُلائی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی

نرالا عشق ہے میرا نرلے میرے نلے ہیں

ظاہر کی آنکھ سے تماشا کرے کوئی

ہو دیکھنا تو دیدہ دل واکرے کوئی

وہ مشتبہ خاک ہوں فیض پریشانی سے صحرا ہوں

نہ پوچھو میری وسعت کی گزیریں سے آسمان تک ہے

تمنا درددل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی

نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزانوں میں

سخن میں سوز الہی کہاں سے آتا ہے

یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے

بزم ہستی اپنی آرائش پہ تو نازاں نہ ہو

تو تو اک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہوں میں

شوخی سی ہے سوال مکرر میں ابے کلیم

شرط رضایہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں

اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

جنہیں اقبال نے بانگ درا میں شامل کیا اور جن کا ذکر چند سطور قبل بھی آچکا ہے۔

اکثر نقادوں کا یہ خیال ہے کہ جگر کی شاعری داغ کی شاعری کا ایک ترمیم یافتہ یا نیا

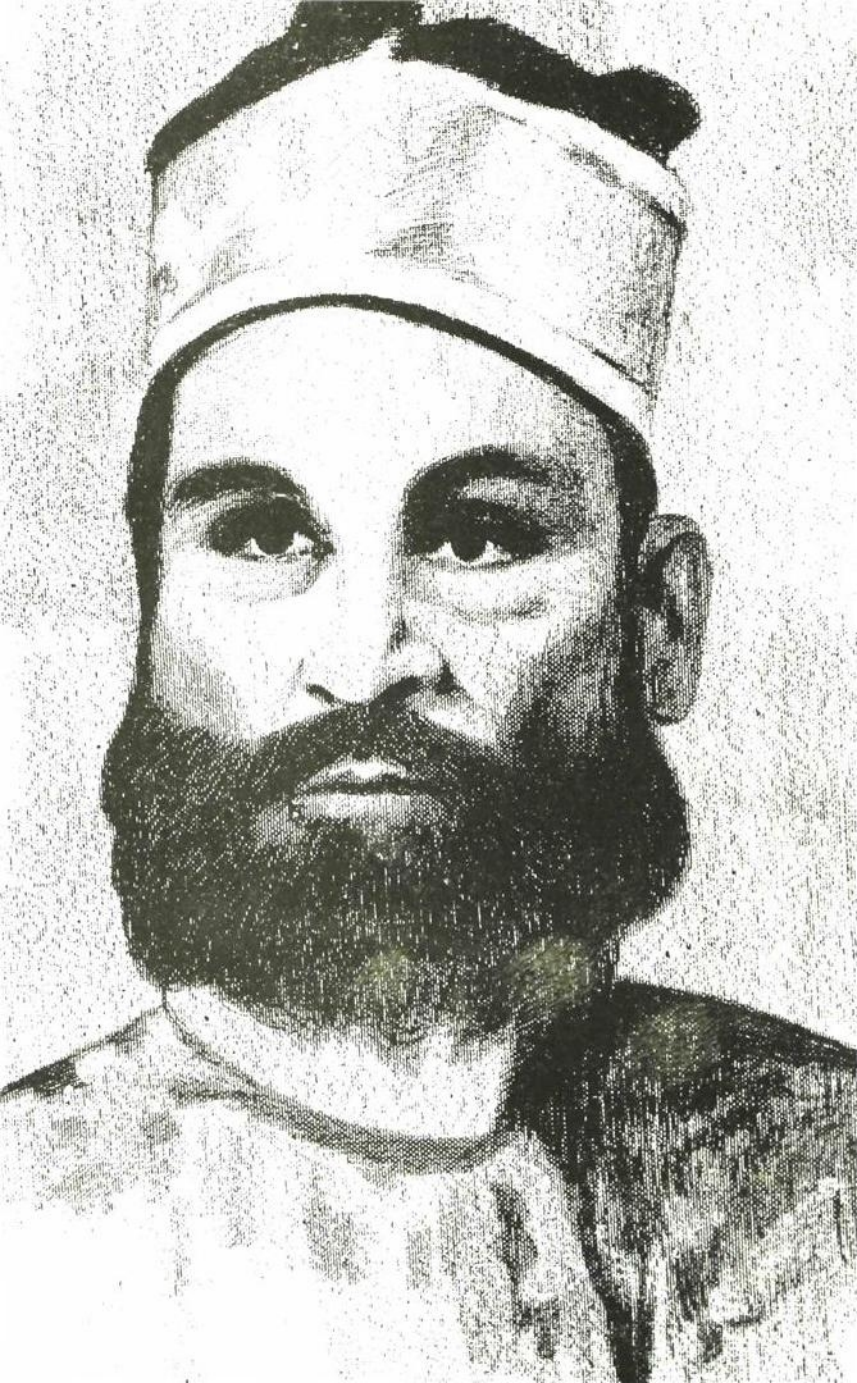
روپ ہے۔ یعنی جگر نے داغ کی زبان استعمال کر کے داغ کے رسمی اور عامیانه خیالات کو

مقابلتہ ایک مہذب صورت دی ہے۔ اس خیال کو مکمل طور پر رد نہیں کیا جاسکتا، لیکن

اگر ہم اقبال کی مذکورہ بالا غزلوں کی ساخت، ان میں داغ کے رموز و کنایات اور اسالیب

بیان کا استعمال دیکھیں تو یہ بات نظر آجاتی ہے کہ یہ دراصل داغ ہی کی شاعری ہے

جسے اقبال نے ایک جدید صورت ہی نہیں دی بلکہ اسے ایک ENNOBLED FORM میں



روایات کے مطابق یہ نیگلے اور تصویر چھوٹی بیگم کے شوہر بلک مارٹن نے تیار کرائی تھی۔ نواب صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ انھوں نے یہ نیگلے میوزیم، نئی دہلی میں محفوظ کر دیا تھا۔ بہت عرصہ ہوا میں نے میوزیم میں وہ نیگلے تلاش کیا، لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی اگر کوئی تلاش کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ نیگلے نہ مل جائے۔ مالک رام صاحب نے چھوٹی بیگم کے بارے میں ایک دلچسپ حقیقت کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ چھوٹی بیگم کی اولاد میں کئی شاعر ہوئے ہیں۔ نواب شمس الدین احمد خاں سے داغ۔ آغا مولوی تراب علی سے شاہ محمد آغا شائق و شاعر غزل اور مرزا فخر سے شاہزادہ خورشید عالم خورشید اور مارٹن بلاک سے بادشاہ بیگم ختی۔ چھوٹی بیگم کا اگست ۱۸۵۹ء میں غالباً رام پور میں انتقال ہو گیا۔

داغ کی شادی

داغ کی عمر تقریباً پندرہ سال تھی کہ اُن کی خالہ عمدہ خانم کی صاحبزادی فاطمہ بیگم سے ان کی شادی کر دی۔ چون کہ عمدہ بیگم کا تعلق صرف نواب یوسف علی خاں ناطم سے رہا تھا، اس لیے فاطمہ بیگم نواب یوسف علی خاں کی صاحبزادی تھیں۔

۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے دوران داغ اپنی والدہ چھوٹی بیگم، خالہ عمدہ بیگم اور سوتیلے بھائیوں آغا مرزا شاعر غزل اور خورشید عالم کے ساتھ دہلی سے نکلے، کچھ روز آنڈلے میں حکیم ولایت کے پاس رہے اور پھر اکتوبر یا نومبر ۱۸۵۷ء میں رام پور پہنچ گئے۔

۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۸ء تک داغ رام پور میں رہے۔ اس دوران میں انھیں کوئی ملازمت نہیں ملی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس زمانے میں اُن کی آمدنی کے ذرائع کیا تھے۔ داغ کی خالہ عمدہ خانم کو سرکار سے تنخواہ روپے ماہانہ ملتا تھا۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ رام پور ہی میں رہتی رہی ہوں۔ کیوں کہ وہ دہلی بھی رہتی تھیں۔ پھر سرروپے اتنی بڑی رقم نہیں تھی کہ داغ، اُن کی والدہ اور بیوی کا خرچ پورا ہو سکتا ہو۔ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اُن دنوں داغ، نواب یوسف علی خاں کے مہمان تھے اور نواب صاحب اُن کا پورا خیال رکھتے تھے۔ بہر حال میرے سیکھتے تحقیق طلب ہے۔

میں پیش کیا ہے۔ داغ کے پیش پا افتادہ مضامین اقبال کے یہاں ارفع اور اعلیٰ قدروں کے حامل بن گئے ہیں۔ ذکر محبوب اور اپنی ذات کا غم جو داغ کے یہاں عیا شانہ یا فاسقانہ یا ہوسنا کی اور رندی کا پہلو لیے ہوئے ہے اقبال کے یہاں آ کے ایک ذہنی کرب کی شدت احساس کا حامل ہو گیا ہے اور وہ اُس شاعری سے بالکل مختلف ہو گیا ہے جسے کھل کھیلنے کی شاعری یا نفسانی خواہشات کی شاعری کہا جائے اور جس کی مثالیں اقبال کے پہلے دور کی شاعری میں موجود ہیں۔

عبوری دور دراصل اقبال کی غزل کا دوسرا دور ہے۔ اقبال نے اگر ان غزلوں کو ”بانگ درا“ میں ۱۹۰۵ء تک ہی کے دور میں شامل کیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ ہر گز نہیں نکلتا کہ ہم انھیں اُن غزلوں میں شامل کر دیں جنہیں اقبال نے ”بانگ درا“ مرتب کرتے وقت اپنے کلام سے خارج کر دیا خواہ ان دونوں کا دور قریب قریب ۱۹۰۹ء تک ہی کا دور کیوں نہ رہا ہو۔ تیسرا دور وہ ہے جو اس غزل سے شروع ہوا ہے۔

زندگی انساں کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں

دم ہوا کی موج ہے دم کے سوا کچھ بھی نہیں

یہ پانچ شعری غزل ہے اور اس کا ذکر محض ایک ترتیب زمانی پیش کرنے کے لئے کیا گیا ہے ورنہ دراصل اس ضمن میں قابل ذکر غزل اس کے فوراً بعد کی غزل ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

نرا الاسارے جہاں سے اس کو عرب کے معار نے بنایا

پنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اس غزل سے لے کے ۱۹۰۸ء کی آخری غزل تک

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے در ماندہ کارِ داں کو

شرِ فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار رہو گا

اقبال کی غزل کا تیسرا دور ہے۔ یہ بھی عبوری دور ہے اور اس لیے کہ عبوری دور کے پہلے حصے میں اقبال کی غزل تغزل کے حُسن اور رچاؤ اور دروگداز کی کیفیت سے

الامال ہے لیکن اجتماعی شعور سے، جس نے آگے چل کر اقبال کی غزل کو ایک انفرادیت دی، بے گانہ ہے اور اس دوسرے حصے کی غزل بڑی حد تک اجتماعی شعور کے حُسن سے اور درِ بشر کی کیفیت سے لبریز ہے لیکن اس میں رچے ہوئے تغزل کی کمی ہے۔ یہ دور بحیثیت مجموعی ۱۹۰۸ء پر آ کر ختم ہو جاتا ہے اور ۱۹۰۹ء میں اقبال کی غزل کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس پر ہر اعتبار سے اقبال کے فکر و فن کی چھاپ ہے۔ اس دور کی بعض غزلیں یہ ہیں۔

نالہ ہے بلبل شوریدہ تراخام ابھی اپنے سینے میں اسے اور ذرا اتھام ابھی
بے خطر کو دپڑا آتشِ نمرود میں عشق عقل ہے مجھ تما شائے لبِ بام ابھی
تو جو بجلی ہے تو یہ چشمک پنہاں کب تک بے حجاب نہ مرے دل سے شناسائی کمر
کب تک طور پر درِ یوزہ گری مثلِ کلیم اپنی ہستی سے عیاں شعلہ سینائی کمر
تو خاک کی مٹھی ہے اجزا کی حرارت سے برہم ہو پریشاں ہو وسعت میں بیاباں ہو
کیوں ساز کے پردے میں مستور ہوئے تیری تو نغمہ رنگیں ہے ہر گوش پہ عریاں ہو
کبھی اے حقیقت منتظر نظر آلباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے ٹپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو تو نوا ہے محرم گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردہ ساز میں
مراسز اگرچہ ستم رسیدہ زخم ہائے عجم رہا
وہ شبیدِ ذوق و فاموں میں کندا ہری عربی ہری

ظاہر ہے کہ یہ غزلیں داغ کے اثر سے بالکل معزا ہیں اور یہ وہ غزلیں ہیں جن کا رشتہ زبورِ عجم سے ہوتا ہوا ”بالِ جبریل“ کی غزلوں سے جا ملتا ہے اور ۱۹۲۸ء تک جب کہ بعض موقعوں پر اقبال کی نظم بھی ہر اعتبار سے تغزل میں ڈھل جاتی ہے داغ کا اثر کہیں نظر نہیں آتا۔ ہاں اکادمی کا شعر کی بات دوسری ہے۔ کہیں کہیں ایک اکیلا مصرع یا ایک آدھ شعر فارسی شاعری میں بھی ایسا نظر آ جاتا ہے جو ہمیں داغ کے اسلوب بیان کی یاد دلانا چاہیے۔ مثلاً۔

حسرت جلوہ آں ماہِ تمامے دارم دست برسینہ نظر بر لبِ باہم دارم
 بر سرِ بامِ آنقاب از چہرہ بے باکانہ کش نیست در کرے تو چوں من آرزو مند و گر
 از ما بگو سلائے آن ترک تندر خور کاش نہ داز نگاہ ہے یک شہر آرزو را
 کو آں نگاہ ناز کہ اول دلم ربود عمرت در از باد! ہمہ تیرم آرزو دست

باز بہ صبر تاب وہ چشم کرشمہ زائے را
 ذوقِ جنوں دو چند کُن شوقِ غزل سرائے را
 عذرِ گناہ کردم و دل در کناہِ من آپہ کشید و گفت کہ تعزیرم آرزو ست
 حلقہ بستند سر تربت من نوحہ گراں
 دلہاں، زہرہ و کشاں، گلبدناں سیم براں

تخلیقِ شعر میں کسی دوسرے شاعر کا اثر قبول کرنا کوئی بجلی کے بٹن کا سامعہ نہیں ہے کہ اسے دآن، کر دیں تو بلب روشن ہو جائے اور دآن، کر دیں تو بلب بجھ جائے۔ مزاج اور طبیعت میں ایک بار سرایت کیا ہوا اثر بالعموم زندگی بھر کا ساتھی بن جاتا ہے۔ وہ نظر آئے یا نہ آئے۔ ہاں بڑے شعر چونکہ کئی اطراف سے اثر قبول کرتے ہیں اور ان کے اندر اپنا انفرادی رنگ پیدا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اس لیے ان کے کلام کے ہر شعر اور ہر مصرعے میں کسی ایک شاعر کے اثرات کی نشاندہی ممکن نہیں اور پھر جب ان کا اپنا رنگ نمایاں ہو جاتا ہے تو دوسروں کے اثر کی تلاش ایک فعلِ عبث بن جاتی ہے۔ ویسے میرے سامنے اگر کوئی دآغ کا یہ مصرع پڑھے۔ چپا کھلی، گلاب کھلا، موتیا کھلی — اور پھر اقبال کا یہ مصرع —
 نرگس و سید دلالہ و سید و سید۔ تو مجھے اسے بھی اقبال پر دآغ کا ایک غیر محسوس یا خفیف سا اثر کہنے میں تامل نہ ہوگا۔

اور یہ جو فارسی کے چند اشعار کی مثالیں اور دی گئی ہیں ان کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دآغ کی براہِ راست اثر پذیری کا نتیجہ ہیں بلکہ اس طرح کے اشعار یا مصرعے محض ایک خفی یا غیر محسوس تاثر کا احساس دلاتے ہیں اور پھر نہ یادہ اہم بات یہ ہے کہ اس طرح کے اشعار یا مصرعے کلامِ اقبال میں ایک تو مستثنیات کی حیثیت رکھتے ہیں دوسرا اس طرح کے اشعار پڑھتے وقت مجھے اقبال کا یہ مصرع اکثر یاد آ جاتا ہے کہ کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو۔

آئندہ مومن رتشی گلزار دہلوی

داغ کے دہلوی تلامذہ!

” اے اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ

ہندوستان میں دھوم ہماری زبان کی ہے

اردو ادب کے اساتذہ و فصحاء میں میر، غالب، اقبال اور انیس پر تو بیشک بہت کچھ کام ہوا ہے اور تحقیقی مقالے ہی نہیں بلکہ چند معیاری کتابیں بھی دستیاب ہیں غالب اور اقبال تو خیر مجموعی طور پر گویا ہندوستان اور پاکستان کے اردو ادب و ارتقار کی علامت ہی بن چکے ہیں۔ دیگر چند اساتذہ پر مثلاً سودا اور ذوق پر بھی پچھلے ۲۰ برسوں میں خود دلی میں ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر تنویر علوی صاحب نے عرق ریزی سے تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ مگر مومن اور داغ پر کسی محقق یا ناقد نے توجہ فرمانے کی کوئی خاص زحمت نہیں فرمائی جب کہ واقعہ یہ ہے کہ زبان کو زبان بنانے والے اور اردو کو روزمرہ بناتے والے نہ غالب ہیں نہ اقبال۔ ایک ٹکسالی، بامحاورہ، ٹھیکہ بولی، روزمرہ، فصاحت اور عام بول چال تک تصویر کشی کرنے میں اور لیلیٰ اردو کی زلفیں سنوارنے والوں میں ہلا کلام داغ کا نام سرفہرست ہے۔

ٹونک کے دیوان ولی کمال صاحب کے محاورات داغ کے بعد اکثر و بیشتر جن حضرات نے داغ کی طرف توجہ فرمائی بھی ہے، تو انھوں نے بھی چند سرسری سے مضامین پر ہی اکتفا کیا ہے۔ ملک کی تقسیم کے ساتھ آزادی وطن کے بعد ہندوستان کے اس حصہ میں جسے اب بھارت بھی کہتے ہیں اور جس کا دارالخلافہ آج بھی میرو سوڈا، غالب دزدق موئن و ظفر، داغ و آزاد اور بیخود و سائل ہی کی دلی ہے۔ اب تک کوئی قابل ذکر داغ شناسی یا داغ فہمی کی طرف توجہ نہیں کی جاسکی۔

داغ پر پچھلے برس ایک مختصر سا اجتماع مولانا انداد صابری صاحب نے منعقد کیا تھا جس میں اس نیا زمند نے ان کی شخصیت، زبان، شاعری اور فن و محاورات پر مجموعی طور سے تفصیلی گفتگو کی تھی اور نواب میرزا خاں داغ، فصیح الملک، دادا استاد کے بیشتر نامور تلامذہ کا تذکرہ کیا تھا۔

میری آج کی گفتگو کا موضوع بہت محدود و مختصر ہے، یعنی ”دہلی میں داغ کے نامور تلامذہ“

براہ راست داغ اور داغ کے تلامذہ پر گفتگو کرنے سے پہلے اجازت دیجئے کہ مختصر اُس دور کا اور اُس دور کی اقدار، حالات اور مرد و جہ زبان و شاعری کی روایات کا سر دست جائزہ بھی لے لیا جائے۔ ۱۸۲۵ء سے ۱۹۰۵ء تک بالخصوص افراط و تفریط، بحران، دم توڑتی مغل حکومت اور قدیم امراء کی ڈوبتی جاگیر داریوں کا زمانہ تھا۔ فورٹ ولیم کالج طے شدہ دور رس سیاسی نکتہ نظر سے دور رسم الخطوں میں ہندی، ہندوی، ہندوستانی کو نئے طرز کی اردو ہندی بنانے میں مصروف تھا۔ مسلمان ردسار اور وابستگان قلعہ معلیٰ کو رسوا اور بے اختیار کیا جا رہا تھا اور انگریز پرست غیر مسلمین کو ابھارا جا رہا تھا۔ عوام تو عوام، خواص کا ایک خاص گروہ جس میں دانشور، ادیب اور شاعر بھی شامل تھے، یا تو تصوف اور خانقاہوں کی طرف رجوع ہو رہا تھا تو ایک دوسرا گروہ رقص و سرود کے بام و در کی طرف مائل ہوتا جا رہا تھا گویا طوائف، کوٹھا، مجر اور مبتذل، مذاق عیش پرستی و عیش کوشی ہماری تہذیب کا محور

بن رہا تھا، یا فرارِ زلیست اختیار کرنے والے لوگ معاشرے کی ذمہ داری، افتادِ تعمیر و تخریب سے بے نیاز، تارکِ الدنیا ہو کر، گوشہ نشین یا زینتِ خالقانہ بہتے جا رہے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سستا مجازی اور بازاری رنگِ عشق و تغزل، زبان پر غالب آتا گیا اور شاعری تقریباً کنگھی چوٹی، آئینہ و آرسی اور پانوں کی طشتی کے قرینوں میں سمٹ کر رہ گئی۔ جس میں نہ مہر کا سوسو گداز تھا، نہ مومن کی سی معنی آفرینی، نہ ذوق کا سا اظہارِ اصطلاحاتِ علوم و فنونِ معقولہ و متداولہ اور نہ غالب کا فکر و تخیل اور ماورائے معاشرہ کوئی بڑی تخلیقات ہی سامنے آرہی تھیں۔ اس وقت تک سیاست، وطنیت، قومیت، ملت اور تحریکات کا وہ تصور بھی رومانہ ہو سکا تھا جو ابتدائی بیسویں صدی کے شعور کی دینا ہے۔

ان حالات میں نواب میرزا خاں داغ نے اردو زبان کو مانجھا، اُسے منہ بولتی زبانِ بزرگ سماج کی حیثیت جاگتی تصویرِ وقت پیش کی۔ زبان کو الفاظ کا محلِ استعمال، محاورہ، روزمرہ فصاحت اور تلفظ اور نیالب و لہجہ عطا کیا۔ جس کا تعلق، صرف کتاب سے پڑھنے سے نہیں بلکہ اُس کے بولنے اور زبان سے ادا کرنے کے انداز سے متعلق ہوا۔

دوسرا بڑا کام اُس وقت یہ ہوا کہ زبانِ عربی، فارسی، ترکی اور دوسری زبانوں کے مروجہ اَدق، نامانوس اور بوہل الفاظ سے صُبح، پاک اور منترہ و مصفا کی گئی۔ اُسے ایک ٹھیٹھ بولی اور ٹکالی زبان کی سند و صحت اور معیار عطا کیا گیا۔

قلعہ کی زبان، بیگمات کی زبان، تعلقداروں اور اُمراء کی زبان، اہل زبان، اساتذہ و فصحاء اور شعراء کی زبان، تصوف و خانقاہ کی زبان، کوٹھے کی زبان و اصطلاحات، حکماء اور قلعہ سے باہر کے اہل علم و فن کی زبان، اردو کے ہندو دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کی زبان، جس میں کشمیریوں کا لہجہ جو مسلمانوں کے سب سے زیادہ قریب تھا، کھتریوں کا طرز اور کالیستھوں کی مفرس زبان کے علاوہ گرجنداروں اور نقالوں کی زبان کے الگ الگ رنگ اور لہجہ سالم سواد ہو کر سامنے آئے۔

جسے کہتے ہیں اردو بیسیویں اُس کے نمونے ہیں
 زبانِ عام میں لیکن بیانِ خاص ہے اپنا
 ہر شخص جو زبان کے اتنے انداز اور طرزوں اور گوشوں سے آشنا نہ ہو وہ خود
 داغ کی زبان اور شاعری کا پورا لطف نہیں اٹھا سکتا۔

اُس کے لیے اُس ماحول کا ترکہ ورثہ میں ملنا بھی ضروری ہے جو دلی والوں کی
 مخصوص محفلوں، ادبی صحبتوں اور اساتذہ کے قدم میں حاصل کردہ تربیت و تہذیب
 بھی شامل ہے، جس میں نشست و برخاستِ آداب گفتگو اور خورد و نوش کے سلیقے
 تک کو دخل ہے، جس کا گو بظاہر زبان یا داغ کی زبان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے، مگر
 یہ سب آداب بھی ہماری زبان و ادب کا حصہ ہیں، جو اس وقت کے معاشرے اور
 داغ اور داغ کے شاگردوں کو سمجھنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

اردو اگر صرف ڈپٹی نذیر احمد کی زبان ہی بن کر رہ جاتی تو بھی اُس کی بقا
 کو خطرہ ہو سکتا تھا، اگر صرف ذوق کے قصائد اور غالب کی ابتدائی چالیس پینتالیس
 برس کی شاعری ہی ہو کر رہ جاتی، تب بھی، اس کی موجودہ حیات و حرکت شاید نظر
 نہ آتی اور وہ ایک جامد و ساکت زبان ہو کر انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں شہید ہو جاتی۔

یہ داغ اور صرف داغ ہی ہیں، جن کی زبان، عالموں کے ترجموں اور لغات
 کے حوالوں اور ایذا طلبی و مشکل پسندی سے آزاد ہو کر کوچہ و بازار میں بھی پہنچی اور
 خواص کے ساتھ عوام کی بھی زبان بن گئی اور بے تکلف بول چال اور اظہارِ خیال کا
 عام مہم ذریعہ بن سکی کہ جس نے ۱۹۴۷ء کا جھٹکا بھی جھیلا اور اُس کے بعد تقریباً
 ۲۵-۳۰ برس کا استحصال بھی بھگتا اور نہ صرف یہ کہ پھر بھی زندہ رہ سکی بلکہ پھلی پھولی،
 پھیلی اور آج کی رونق دیکھ سکی۔

حضرات اب براہِ راست اپنے موضوع کی طرف آتے ہوئے عرض کروں گا کہ
 اس پس منظر ہی میں ۱۸۷۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کی دلی اور اس کے اساتذہ کو سمجھنا اور
 پڑھنے کی کوشش فرمائیں گے تو داغ کے دہلوی تلامذہ کے کلام کا لطف لے سکیں گے۔

میر مہدی مجروح، الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، منشی امیر مینائی اور انور دہلوی کی موجودگی میں جو سکول داغ قائم کر سکے، بلکہ ہندوستان میں چھوڑ گئے وہ اپنی جگہ سب سے منفرد و وسیع، پائیدار اور اردو کے ماضی قریب اور حال کی ضمانت ثابت ہوا اور انشاء اللہ مستقبل کا بھی سب سے قد آور اور مستند سکول رہے گا۔

داغ کی بلند اقبال نے اقبال تک کو مسحور کیا اور اپنا شیفتہ و گردیدہ بنا لیا اور وہ بھی اس دور میں، اپنی مختلف افتاد طبع کے باوجود، داغ ہی کی شاگردی کو منتخب کرنے پر مجبور ہوئے۔

علامہ اقبال، بیخود بدایونی، باغ سنبھلی، سیماب اکبر آبادی، نوح ناروی، احسن مارہروی، بزم آفندی، یوسف لاہوری، مولانا ناطق گلاڑھٹی سے لے کر بیخود دہلوی، نواب سائل، آغا شاعر قزلباش اور علامہ زائر زشتی دہلوی، یادگار داغ ہستیوں تک۔

ع : داغ آخر دے گئے دنیا کو کتنے اہل فن

میں ان اساتذہ میں سے آخر الذکر دہلی کی قصر شاعری کے چار ستونوں کے متعلق اب کچھ گفتگو کروں گا، جس پر دلی کا قصر اردو کھڑا ہے جو داغ سکول کی روح رواں تھے۔ دہلی میں تلامذہ داغ یوں تو بشمار تھے، کچھ جانے پہچانے اور انجانے کچھ داخلہ کچھ برائے بیعت، مگر ان چار اساتذہ کو تمام دنیائے اردو نے اردو کے سبھی گلمستائوں اور دبستانوں نے مسلم الثبوت اور فصیح العصر تسلیم کیا اور داغ کے تلامذہ پر جس نے بھی کہیں کچھ تحریر کیا ہے ان میں ان چاروں کا تذکرہ سہر جگہ ادب و احترام اور محبت سے کیا گیا ہے۔

حضرت وحید العصر استاد حاجی منشی سید وحید الدین بیخود دہلوی اُن

میں سرفہرست ہیں۔

چچا بیخود ابتدار میں مولانا حالی کے شاگرد تھے۔ جب سر سید احمد خاں حالی کو دلی سے علی گڑھ لے چلے تو مولانا حالی نے بیخود صاحب کو خود داغ کے پاس

ے جا کہ ان کا شاگرد کیا۔ یہاں یہ لطیفہ بھی سن لیجئے کہ جب مولانا حالی نے یہ فرمایا کہ حضرت اس نوجوان کی طبیعت شوخ و شنگ ہے اور لڑتی ہوئی طبیعت کا مالک ہے اور آپ کے رنگ سے ہم آہنگ ہے اسے اپنی شاگردی میں قبول کریں تو نواب میرزا نے فرمائش کی کہ صاحبزادے کچھ سناؤ تاکہ ہم بھی اندازہ کریں کہ کیا کہتے ہو۔ تب فیصلہ کریں گے کہ تمہیں شاگرد کریں یا نہ کریں۔ تو بیخود صاحب نے دو غزلیں سنائیں داغ نے بیساختہ داد دی اور پسند فرماتے ہوئے کہا کہ یہ تو بنے بنائے شاعر ہیں مگر مولانا آپ کے حکم کی تعمیل میں میں اسے اپنا شاگرد کرتا ہوں۔ اب بیخود صاحب کا جلالی رنگ چمکا اور فوراً بولے قبلہ ذرا ٹھہریے۔ مجھے بھی کچھ عرض کرنے دیجئے۔ دادا استاد نے کہا ہاں ہاں ضرور کہو کیا بات ہے بیخود صاحب نے کہا ذرا آپ بھی اپنا کلام سنائیں تاکہ میں بھی اندازہ کر سکوں کہ مجھے آپ کا شاگرد ہونا چاہیے یا نہیں اور بلا تکلف داغ صاحب نے دو تین غزلیں سنائیں جس کے بعد بیخود صاحب نے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

بیخود صاحب کو میں نے ۱۳۳۳ھ سے ۱۳۵۵ھ تک مستقل اور متواتر دیکھا ہے۔ میں آخر دم تک باقاعدہ ان کی خدمت میں جاتا رہا۔ ہر چند کہ نصابی اور درسی تعلیم و تدریس میں ادیب فاضل، منشی فاضل وغیرہ کی تحصیل میں مولوی عبدالحق علامہ ہندوستانی داتا تیر میرے استاد تھے اور قومی نظمیں بھی میں کبھی صاحب کو دکھاتا تھا۔

غزل میں یا علامہ زار دہلوی میرے والد ماجد یا نواب سائل میں سے اصلاح لیتا رہا۔ مگر بیخود صاحب کے مشاعروں، گھر پر نجی محفلوں اور ملاقاتوں کا سلسلہ حین حیات تک برابر قائم رہا۔

وہ جہاں کلام فن اور قلعہ کی مستند زبان کے امین تھے، وہاں ان کے کمال کے ساتھ ساتھ ایک ”جلالی“ انداز ہمیشہ غالب رہا۔ موٹی موٹی گالیاں بے تکلف اور بے تکان دیتے تھے، آخری پندرہ سولہ برس میں جب وہ بہت ضعیف و نحیف ہو گئے تھے، انٹریاں اکثر اتر جاتی تھیں، تو ملاقات میں بھی تباہت محسوس کرتے تھے، ایسے میں کوئی ملاقاتی اگر اتفاق سے شاعر ہوتا اور کوئی غلط شعر پڑھ دیتا تو سخت

کلامی سے تواضع فرماتے تھے۔ اپنے بڑی بڑی داڑھی والے شاگردوں کی بھی فنی غلطیوں پر سکول کے طلبہ کی طرح مَرغہ بنا کر اپنے دوا میں اُن کی کمر پر رکھوا دیتے تھے۔

پینڈت امر ناتھ مدن ساآمر سے اُن کے بڑے گہرے مراسم تھے، مگر کسی بات پر ان بن ہو گئی تو کہا بڑھے اب تیرے مشاعروں میں نہیں آؤں گا۔ یوں عمر بھر مزاج پر سی کو جاتے رہے، مگر ان کے ماہانہ اور سالانہ مشاعروں میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں جب ساآمر صاحب کی بزم سخن دہلی کی سلور جوبلی منعقد ہوئی اور سہ روزہ مشاعرے اور جلسے منعقد ہوئے اور سارے ہندوستان کے اساتذہ، دہلی، لکھنؤ، رامپور، پنجاب، حیدر آباد، الہ آباد وغیرہ ہر جگہ سے آکر شریکِ بزم ہوئے مگر بنجود صاحب دودن تک تشریف نہ لائے تو اساتذہ میں بڑی چہرے گویاں ہوئیں۔ قصہ قصنیہ تو بہت طویل ہے مگر مختصراً یہاں صرف اتنا عرض کروں گا کہ بالآخر حیب میرے والد علامہ زار پر سارے اساتذہ نے یہ ذمہ داری ڈالی کہ آپ ہی انھیں لاسکتے ہیں، لایئے۔ تو بہر حال وہ آئے اور آتے ہی جہاں گروپ فوٹو کے لیے تقریباً جملہ اساتذہ جمع ہو چکے تھے، کوئی عصر کے وقت تک رہے اور شریکِ مغل ہوئے اور کہنے لگے کہ ”اے بھائی بڑھے اب تو دہلی کی ناک نہیں کٹی تیری بات رہ گئی، میری قسم ٹوٹ گئی“ میں آگیا، تصویر کھینچو اے اور یہیں دوڑوں غزلیں سن لے۔ اب رات کو نہیں آؤں گا۔“

بنجود صاحب سانولے رنگ، چوڑے چکلے سینے، لمبے ہاتھ، پہلوانی کسرتی جسم کے مالک تھے۔ سفید براق چاندی سی خوشنما پھیلی ہوئی سرسیدی داڑھی کے مالک تھے۔ ہزارہ تسبیح، دو تین دیوان، دو تین بیاضوں کے بستے ساتھ لے کر مشاعرے میں جاتے تھے۔ تنگ پا جامہ اور اچکن پہنتے تھے، گھوڑ سواری، نشانہ بازی، شکار، کبوتر بازی کا شوق رکھتے تھے۔ عیسائی پادریوں کو اردو فارسی پڑھاتے تھے اور انگریز ۱۰۰۰۵ افسروں کو بھی اردو فارسی سکھاتے تھے، کسی ہم عصر کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ چنانچہ صفحہ لکھنوی سے اُس مشہور ملاقات و گفتگو کے حوالے سے، جسے میں پہلے ایک مضمون میں لکھ چکا ہوں، یہ تاریخی جملہ کہا تھا: جواب زباں زدِ خامو و عا

داغ کی اولاد

رام پور میں داغ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا، احمد مرزا نام رکھا گیا۔ بچپن ہی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ داغ کو اس حادثے کا بہت صدمہ تھا۔ تکلیف کا طبی کا خیال ہے کہ احمد مرزا ان کے رشتے کے ایک بھائی کا لڑکا تھا۔

جب تک نواب یوسف علی خاں حیات رہے۔ رام پور میں داغ کی ملازمت کا کوئی سلسلہ نہیں بنا۔ ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء کو نواب صاحب کا انتقال ہوا اور نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے۔ داغ نے اپنی ذہانت مختلف فنون پر مہارت اور شاعرانہ صلاحیت سے نواب کلب علی خاں کو متاثر کر لیا تھا۔ اس لیے انھوں نے ۱۴ اپریل ۱۸۶۵ء کو زمرہ مصاحبین میں ان کا تقرر کیا۔ کارخانہ جات، فرش خانہ اور اصطل کی داروغگی ان کے سپرد ہوئی۔ ستر زو پے ماہانہ تنخواہ قرار پائی۔

یہاں خود داغ کی ترانی ایک دلچسپ لطیفہ سن لیجئے۔ ”ہم رام پور پہنچے اور ہمیں اصطل کی افسری عطا ہوئی تو بعض لوگوں میں اس اعزاز کی بنا پر رشک و رقابت کے جذبات ابھرے اور ہر طرح مخالفت کی گئی اور اکثر معاملات میں بعض لوگ بظاہر باطن خارج ہوئے۔ ایک روز عجیب واقعہ ہوا۔ صبح کو جب اصطل پہنچے تو دروازے پر ایک کاغذ چسپاں دیکھ کر غور کیا تو اس کاغذ پر یہ شعر لکھا ہوا تھا:

شہر دہلی سے آیا اک مشکی

آتے ہی اصطل میں داغ ہوا

یہ شعر ہماری ہجو میں تھا۔ لیکن اس شعر میں جن لفظی رعایتوں سے کام لیا تھا اور ہمارے کالے رنگ اور گھوڑے کی مشکی قسم کی رعایت سے جو ستم ظریفی کی گئی تھی، اس کو محسوس کر کے بے اختیار داد دینے کو دل چاہا۔ ہمارے نام کی رعایت سے جو گھوڑے داغ گئے تھے، اس نے اور زیادہ لطف دیا۔ میں نے لوگوں سے اس شعر کے کہنے والے کے متعلق بہت معلوم کیا۔ اعلان بھی کیا کہ اس شعر کا کہنے والا کون ہے؟ اگر مجھ سے آکر ملے تو میں

ہے اور مختلف لوگ اُسے مختلف احباب سے منسوب کر کے سناتے رہتے ہیں اور وہ یہ کہ جب صفی صاحب نے پوچھا کہ بھائی بیخود اب ہندوستان میں مستند استاد کون رہ گئے ہیں تو بلا تکلف بیخود صاحب نے کہا کہ ”بس دو ہی تو ہیں۔ ایک نم اور ایک میں۔۔۔۔۔ اور تم بھی کیا!“

مجھے فخر ہے کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۵ء تک ہماری انجمن تعمیر اردو کے تمام بڑے آل انڈیا مشاعروں اور جلسوں میں اور آخری اساتذہ ہند کے استقبال میں قید چچا بیخود برابر شریک ہوتے رہے اور مجھے نوازتے رہے۔ ان کے بارے میں واضح بیان کرنے لائق یوں تو بہت ہیں جس کے لیے ایک الگ کتاب درکار ہے، مگر یہاں اُن کے صرف چند اشعار سن کر ان کا تذکرہ اس وقت ختم کروں گا۔

اب کسی اور کو چاہیں گے ملیں گے اُس سے
آپ ہٹ جائیے بس آپ سے کٹی کر دی
مجھ کو بیخود نہ سمجھ خوب سمجھتا ہوں تجھے
شمع میرے ہی جلائے کو تو ٹھنڈی کر دی

تصویر کیوں دکھائیں تمہیں نام کیوں بتائیں
لائے ہیں ہم کہیں سے کسی بے وفا کی ہے

ڈرامہ افسانہ، غالب کے دیوان کی شرح اور گفتار بیخود۔ در شہور بیخود دیوان افسانہ بے شمار شاگرد بھی چھوڑے جن میں اب کامل قریشی رہ گئے ہیں۔ (این سائل، مخور، نافذ، قدا خالدی، عاصمی، صابر، پنا لال، شکر شاد، یکتا وغیرہ)

بیخود صاحب کے اکثر و بیشتر پیر بھائی اُنھیں اپنا امام اور امام غزل مانتے اور کہتے تھے۔ ہاں صرف نواب سائل سے جانشینی کے مسئلہ پر اکثر نوک جھونک اور چٹمکیں رہیں۔ اللہ اس باقی باہلی سید کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، داغ سکول کی روشن ترین شمع تھی کہ گل ہو گئی۔

افسر الشعر آغا شاعر قزلباش دہلوی، فصیح العصر شاعر، اور محاکات نگار غزل گو شاعر تھے، جس میں منظر طرازی، تصویر کشی اور نوحہ و مرثیہ کارنگ گہرا تھا۔ گورے چپے تھے آخری عمر میں خوبصورت سنواری ہوئی مختصر ڈاڑھی رکھ لی تھی۔ گرچہ بیشتر عمر تک ”کلمین شیو“ رہے۔ خود بلے تڑنگے اور مضبوط جٹے کے آدمی تھے مگر ہمیشہ ایک موٹا سا ڈنڈا کان سے قدرے اونچا اپنے ساتھ رکھتے تھے جس پر ایک کنارے پر چاندی کا مٹھا چڑھا ہوتا اور نیچے تانبے کے حلقے پھلے وغیرہ۔ وہ ایک شیعہ عالم و مجتہد بھی تھے۔

مشاعروں میں بڑی حسن ادا کے ساتھ ڈرامائی انداز میں مجلسوں کے انداز میں شعر پڑھتے تھے۔ دو ایک شعر پڑھ کر نیم گریہ کے سے انداز میں بیٹھ جاتے تھے۔ لوگ پر زور و شور انداز سے مزید پڑھنے کی فرمائش کرتے تو کہہ دیتے تھے میاں کیا صنوگے باقی سب شعر بھی ایسے ہی ہیں۔

یہاں ”شاعر کے سوشل“ کے نام سے ایک مختصر ساجھی جنتری نما کتابچہ بھی شائع ہوا تھا۔ آغا آفتاب، آغا سرخوش اُن کے دو بیٹے اور آغا سحاب قزلباش اُن کی صاحبزادی کراچی میں موجود ہیں۔

جوش ملیح آبادی ان کے بہت اقرب دوست اور مجلس تھے اور جب تک وہ زندہ رہے اُنہی کے پاس موری گیٹ محمد علی بازار میں اپنی محفلیں گرم کرتے تھے۔ منشی مہاراج بہادر برقی اُن کے نامور شاگرد تھے۔ شیش چند طالب، دھرم پال گیتا ونا۔ منشی ڈگبر پرشاد جین گوہر، شیر سنگھ جین ناز، نازاں لطیف کیف دہلوی اور حکیم حبیب اشعر اُن کے جانے پہچانے شاگرد اور وابستہ عقیدتمند احباب میں رہے ہیں۔

موصوف بھی کوٹک دار اور گرج دار آواز میں گفتگو کرتے اور بہت غصیلے بزرگ تھے۔ عام طور پر تہمد زبیں تن فرماتے تھے۔ داغ کے دہلوی شاگردوں میں سب سے پہلے رخصت ہوئے۔

ابوالمعظم نواب مرزا سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی، جانشین و دامادِ داغ ان کے ایک اہم ترین شاگرد تھے۔ دہلی کی وضع داری، تہذیب، اخلاق و شرافت، بلند کرداری، صوم و صلوات، ترسیلِ علم و فن، وظیفہ و درود کا مسلسل ورد ان کا مزاج تھا۔ انھیں کسی نے کبھی گالی دیتے نہیں سنا۔

نہایت خوبصورت، خوب سیرت، نخلص بزرگ تھے۔ آخر زندگی توکل صبر و قناعت اور الفقر و الفخری میں گزری۔ مگر احباب اور مہانوں کے لیے دسترخوان ہمیشہ وسیع رہا۔ گھر کے زیور اور جائیداد بیچ کر گزارا کرتے مگر رکھ رکھاؤ میں فرق نہ آنے دیتے۔ حسن سلوک جاری رہتا۔ ان کے اکثر شاگرد بھی انھیں خوب لوٹتے رہتے تھے۔ یوں تو ان کے سینکڑوں شاگرد تھے۔

نظم گوئی میں نہال سیوہادی اور غزل گوئی میں بھائی خاں کو اپنی دو آنکھیں بتاتے تھے۔ میں نے اسلامیات کا درس، تلمیحات شمس تبریز و مولانا روم، تلمیحات اقبال اور اساتذہ لوہارو کے سلسلے میں انہی سے اکتساب فیض کیا اور بہت سی غزلوں پر ان کی اصلاح بھی لی۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک برابر ان کی خدمت میں حاضر رہا۔ میرے بھائی اور میری والدہ بھی ان کے ہی شاگرد تھے۔ دلی میں شا کر، واصل، کامل نظامی، حضرات بھی ان ہی کے شاگرد تھے۔

ان کے گھر کا آئین تمام علماء و ادبا اور فصحا کا مزع و مرکز تھا اور تلامذہ و احباب کی تعلیم و تربیت، تہذیب کمال اور اکتساب فیض کا بہت بڑا مرکز تھا۔ عصر سے مغرب تک اور عشاء سے نصف شب تک بعض محفلیں جاری رہتی تھیں۔ ان کے بیٹے نواب قطب الدین فصیح ابن سائل عرف محمد میاں، خاں صاحب کے ہم عصر اور میرے بھائی نے تکلف بڑے بھائی تھے۔ جمیل الدین عالی جو ان کے نواسے ہوتے ہیں، میرے ہم عصر، ہم سبق، ہم جماعت اور بچپن کے ہم نشین و دوست ہیں۔ وہ بھی ان کے شاگرد تھے۔ گرچہ بعد کو وہ میرے والد زاد صاحب کے شاگرد ہو گئے تھے۔

نواب صاحب جتنے خوبصورت و وجیہ شخص تھے اتنے ہی خوش پوش بھی تھے اور

کھانے پینے میں بھی متمول مزاج رکھتے تھے گرچہ حالات سے تنگ آکر انہیں یہ بھی کہنا پڑا ہے
 رکھا ہے تخلص یہ مجبور سائل ہوئی احتیاجوں کی جب اتنی مشکل
 ملے دانہ کھانے کو جب دانہ مانگو۔ میسر ہو پینے کو پانی کہو تو

جب آخری مرتبہ مرزا داغ کے پاس حیدر آباد تشریف لے گئے، وہاں زمین پر سے پاؤں
 پھسل گیا اور کوہلے پر سے ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی جو آخر تک اُن کے چلنے پھرنے میں
 مانع رہی۔ چنانچہ اُس کے بعد ہمیشہ اپنی ذاتی رکشا میں سارے شہر کا شام کو طواف کرنے
 یعنی سیر و ملاقاتِ احباب کے لیے نکلتے تھے۔

لال کنواں، لال دروازہ سے فتح پوری، ہارڈنگ لائبریری، جنا، دریا گنج، اردو بازار
 جامع مسجد، چوڑی والان، بازار ستی رام، گلی کشمیریان، حوض قاضی ہوتے ہوئے واپس
 اپنے دولت خانے پر جاتے تھے۔

حضرات فصیح الدین احمد، شبیبہ الحسن بختیاری، مفتی کفایت اللہ مولانا دامت دہلوی،
 پنڈت امر ناتھ مدن سائر اور علامہ زائر دہلوی سے اس طواف میں ملاقات تقریباً روزانہ
 رہتی تھی۔ اس سیر و سفر میں بھی نیاز مند اکثر و بیشتر اُن کے ہمراہ ہوتا تھا۔ کم از کم جامع مسجد
 سے اپنے گھر اور پھر اُن کے دولت کدے تک۔

دہلی کی تہذیب شرافت کا محترم، اسلاف کی نشانی، دلی کا نام لیوا، داغ کی زبان
 کی رنگینوں اور شوخیوں کا امین، اگر کسی ایک شخص کو قرار دیا جاسکتا ہے تو اُس میکرم خوش
 وضع کا نام ہوگا نواب سراج الدین سائل۔

یوم داغ کے ایک مشاعرے میں نواب صاحب کے فرزند بھائی فصیح نے جب غزل
 پڑھی تو مشاعرے میں کافی شور داد و تحسین بلند ہوا۔ استاد بیخود نے پوچھا کون پڑھ رہا
 ہے۔ حاشیہ نشیوں نے بتایا کہ ابن سائل ہیں۔ قبلہ نے توجہ سے فصیح ابن سائل کی غزل
 سنی۔ جب وہ پڑھ چکے تو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کلام کسے دکھاتے ہو۔ اُنھوں نے جواب
 دیا کہ ابابھی کو دکھایا ہوں۔ بیخود صاحب نے کہا ”مجھے دکھایا کرو، ابابے اچھے شعر
 کہنے لگو گے“ محمد میاں فصیح نے یہ بات گھر جا کر سائل کے گوش گزار کی۔ چچا سائل نے کہا

بھی صبح گیارہ بجے تیار رہنا، بخود صاحب کے یہاں چلیں گے، اگلے روز سائل صاحب اپنے صاحبزادہ محمد میاں کو لے کر بخود صاحب کے یہاں تشریف لے گئے۔ دُقی الباب کیا۔ کنڈی کھٹکھٹاتے ہی ایک نہایت نجف آواز میں کسی نے پوچھا کون ہے؟ جواب میں اُدھر سے کہا گیا سائل ہوں! پھر آواز آئی ہاتھ خالی نہیں ہے..... خیر اندر آ جاؤ سید چغری فرزندِ استاد بخود دوڑے ہوئے خدمت میں پیشوائی و استقبال کے لیے حاضر ہوئے اب سب لوگ اندر پہنچے۔ رسمی سی علیک سلیک کے بعد سائل صاحب نے فوراً مطلب کی گفتگو شروع کرتے ہوئے بخود صاحب سے پوچھا بھائی کل آپ نے اپنے دل بند سے مشاعرہ میں کیا فرمایا تھا۔ بخود صاحب فوراً بولے جی ہاں ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ اس میں غلط کیا ہے۔ سائل صاحب نے چنانچہ باضابطہ درخواست کی تو لیجئے سنبھالیے اپنے شاگرد کو اب یہ آپ کے حوالے ہیں اور مجھے اجازت دیجئے۔ اللہ اللہ یہ شانِ اخلاقِ حمیدہ۔ خود بیٹے کو اُن کا شاگرد کیا اور تمام عمر جانشینی کے معاملہ میں اُن کی طعن و تعریض اور مضحکہ خیز جملہ بازیاں سننے رہے۔

”پارہ کجکول“ کے نام سے چند غزلوں کا ایک کتابچہ شائع ہوا۔ کئی قلمی مسودے اور تین دیوانوں کی بیاضیں اور تقریباً دس ہزار اشعار پر مربوط ایک مثنوی گفتار جہانگیر نور جہاں“ جس میں پوری تیموری خاندان کی تاریخ ہے، قلمبند فرمائی مگر آج تک کچھ بھی شائع نہ ہو سکا۔ گذشتہ سال جناب خالد ابن منشی عبدالقدیر صاحب مرحوم، مالک اردو اکادمی سندھ کراچی نے پاکستان کے میرے دورے کے موقع پر بتایا تھا کہ اب وہ کم از کم یہ مثنوی شائع کر رہے ہیں جو ابن سائل نے خود اُنھیں دی تھی، میں نے اس رجسٹر کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور دو دن تک اُسے مکرر پڑھ کر اپنا ایمان تازہ کیا۔ واقعات تو چچا کے بارے میں سینکڑوں بیان کر سکتا ہوں۔ مگر ایک قصہ سن لیجئے ۱۳۴۷ء میں ایک تاریخی طرحی مشاعرہ میرٹھ میں منعقد ہوا۔ جملہ استاذِ ہند مدعو تھے۔ زمین تھی..... کام آہی گیا، جام آہی گیا..... قبلہ نے شعر پڑھا

چاندنی کو ماند کرنے وہ نقاب رُخ کے بند

ڈھیلے کرتا ٹھلٹا بالائے بام آہی گیا

چچی بیگم (بنت داغ) جو کمرے سے متصل ہی چن کے پاس کرسی بچھائے بیٹھی تھیں فرمانے لگیں کہ ”آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا۔ پیروں سے چلا نہیں جاتا۔ منہ میں دانت نہیں پیٹ میں آنت نہیں، قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ معشوق سامنے آئے تو مطلق گدھی نظر آئے۔ اور جب دیکھو گئے ہیں سناتے بالائے بام آہی گیا اور زیرِ دام آہی گیا اور کام آہی گیا۔ بیٹے تم نہ ایسی شاعری کرنا۔“ بہر حال اسی غزل کا ایک شعر اور سنیں۔

انکا پس خوردہ میرے حصے میں جام آہی گیا

بعدِ مدت ہاتھ ماہِ ناتمام آہی گیا

مجھے بھی حکم ہوا کل تم بھی اسی زمین میں غزل کہہ کے لانا۔ میں نے تھوڑی دیر میں وہیں ایک شعر موزوں کر کے حاضر کیا کہ

عظمتِ رفتہ کے اوراق پریشاں دیکھ کر

خود بخود ہونٹوں پہ لفظ انتقام آہی گیا

جس کی آنکھوں نے بہت داد دی۔ چچی بھی بہت خوش ہوئیں اور مجھے یہ طور خاص چائے کے ساتھ کیا بوں کے علاوہ حبشی حلوہ سوہن کھلایا۔

بھائی خاں کی شادی کے موقع پر بارات کی بنارس سے دہلی واپسی پر نامساعد حالات میں بھی چچی مٹھائیوں اور پھلوں کے کئی بھال ڈولی میں رکھ کر غریب خانے پر تشریف لائیں اور سونے کا تہرا چھلّا برائے انگوٹھی عطا کیا اور دہن کے لیے متعذر دیکڑے وغیرہ عطا کیے۔ جبکہ گھر کا حال تقریباً ناگفتہ بہ تھا۔

اب ان کی غزلوں کے چند منتخب اشعار سن لیجئے۔

کہیں مجنوں کہیں وامق رقم یوں بھی ہے ادویوں بھی

سنا بھی کبھی ماجرا درد و غم کا کہی دل جلے کی زبانی کہو تو

مجھے بیت بازی کا شوق، مناظروں میں مذہب کے تقابلی مطالعہ اور مباحثوں میں پڑھ کر شریک ہونے کی ترغیب اور مختلف ادیان سے واقفیت کا شوق نواب سائل اور اپنی والدہ ہی سے ملا۔

بیت بازی کا ذکر آیا ہے تو صرف ذرا سا ذکر یہ بھی سن لیجئے کہ ایک مرتبہ چوک کش گنج لائبریری روڈ پر پنجابی مسلمانانِ دلی کی طرف سے شیخ انوار الحق حقی ایڈیٹر رسالہ ”قوم“ نے ایک بیت بازی کا تمام کالجوں اور یونیورسٹی کے طلبہ کا مقابلہ رکھا۔ جس میں میں بھی مدعو اور شریک تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک حرف اور لفظ کے اشارے پر وہاں کے پنجابی مسلمان طلبہ اُس دور میں اقبال کے کلام سے بندہ پیش کرتے تھے، بالخصوص مشکوٰۃ اور جواب مشکوٰۃ میں نے والدہ ماجدہ زار صاحبہ اور چچا سائل سے اپنی مشکل اور ضرورت بیان کی۔ انھوں نے کہا: ڈ، ڈ، ڈ، اور رش کے شعر لکھ لو اور یاد کر لو۔ چنانچہ اس میں سے ایک شعر حاضر ہے۔

ڈال کر تھوڑی سی مے در شیخ کو

صرف شربت کیوں پلائے، ہو عبت

باقی دو ایک شعر زار صاحب کے تذکرے میں پیش کر دوں گا۔ ظاہر ہے معرکہ ہمارے ہاتھ رہا۔ بقول خاں صاحب کے۔

جس پہ دلی ناز کرتی تھی وہ ہستی مٹ گئی

کاش اس دل سے کوئی پوچھے، یہ بستی مٹ گئی

میں نے ان کے انتقال سے ایک ہفتہ بعد ہندو کالج دلی میں یوم سائل کا اہتمام کیا۔ حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی، مولوی عبدالحق، آغا یعقوب دہلوی، سید وقار عظیم، اے، ایس بخاری پطرس، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، خواجہ محمد شفیع، کنور ہند سنگھ بیدی، سحر، مولانا ماہر نقادری، راز مراد آبادی، نخب جارجوی اور شکیل بدایونی وغیرہ متعدد حضرات شریک ہوئے۔

شکیل صاحب کا ایک شعر سن لیجئے اور اُس پر نواب سائل مرحوم کا ذکر اس

گفتگو میں یہیں ختم کر دوں گا:

نکل کر بزم آب و رنگ سے جنت میں جا پہنچا

بہ الفاظِ دگر پھر داغ کی خدمت میں جا پہنچا

اور اس قابلِ فخر تہذیبوں اور یادوں کی تکرار میں آخر میں اپنے آباؤ اجداد کے
پروفیسر پنڈت تر بھون ناتھ زلشی زائر دہلوی یادگارِ داغ کا ذکر کروں گا۔

علامہ زائر دہلوی کے دسہرے کے تہوار سے تیسرے روز پیدا ہوئے اور حکیم محمود احمد خاں

والد ماجد حکیم اجمل خاں صاحب کے ایما پر شریف منزل دہلی میں ۱۳۱۵ء میں نواب مرزا خاں داغ دہلوی
کے شاگرد ہوئے۔ پہلے مومن داغ ہی کے رنگ میں شعر کہتے تھے بلکہ ساری عمر ہی کہتے رہے۔

مگر ۵۰-۵۲ برس کی عمر کے بعد پنڈت سائید دہلوی کی قربت کی وجہ سے خواجہ میر درد کا
رنگ اپنایا اور تصوف کو ان کے کلام میں ہمیشہ غالب دخل رہا۔ ۹۵ برس کی عمر میں، آخر

نک شعر کہتے رہے۔ لاکھوں شعر کہے مگر کبھی چھپوائے نہیں۔ بارش، دھوپ، دیک، کاغذ
کے کیڑے اُسے اپنی غذا بناتے رہے۔ وہ اپنے کاغذات کو چھوٹے نمک نہ دیتے تھے۔ پہلے

مولانا سیف الملق ادیب دہلوی سے بھی اکتسابِ فیض کیا، مگر بعد کو صرف داغ کے ہونے
رہ گئے اور تقریباً ۲۶-۲۷ برس نواب میرزا سے شرفِ تلمذ اور فیضِ سخن جاری رہا۔

مولانا نسیم بھرتپوری کے بعد میرے والد داغ کے سب سے پہلے اور سینئر

(ELDEST & OLDEST) شاگرد تھے۔ ہمارے چچا استادوں میں بخودین، نواب سائل،

نوح، احسن، مولانا محمد علی جوہر، بزم، یوسف، اقبال، شاعر، سیامب اور جوش ملیح آبادی

حضرات سب بعد کو ان کے شاگرد ہوئے اور سب کے سب سارے ملک پر چھائے گئے

اور ایسا چھائے کہ اب فی زمانہ برصغیر ہند و پاک میں آج عصرِ داغ ہے اور صرف

عصرِ داغ (DAGH AGE)

میرے والد اور انٹیل کالج لاہور میں مولانا محمد حسین آزاد کے بھی شاگرد رہے اور

ان سے فارسی و عربی پڑھی۔

کچھ مدت زائر صاحب رسول گجران، مغربی پنجاب میں ریاضی اور اکاؤنٹ کے

استاد رہے جہاں پنڈت بالمنند عرش مسیانی اُن کے شاگرد ہوئے۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۶۶ء تک اندر پرستھ کالج دہلی اور اسی دوران دس برس دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی کے پروفیسر رہے۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد دہلی میں تقریباً ۳۹ سال اردو فارسی و عربی پڑھاتے رہے۔

سہ غزل، چوغزل کہتے تھے۔ اور سہ غزل میں شاید ہی کوئی قافیہ اُن سے بچتا ہو۔ صنعت تارنخ گوئی میں یدِ طولی رکھتے تھے۔ صنعتِ توشیح میں قطعات کہنے کے منفرد استاد تھے۔ طرحی مشاعروں میں ایک غزل زبان میں، ایک مضمون کی، ایک تغزل اور ایک قصوف و معرفت کی کہنا ضروری سمجھتے تھے۔ خواجہ احمد فاروقی نے PH D میں اُن سے اکتساب کیا۔ بیگم قرۃ العین حیدر اُن ہی کی شاگرد ہیں اور وہ اس پر فخر کرتی ہیں اور ہر ملاقات میں مجھ سے اس کی تجذید و اقرار ضرور کرتی ہیں۔ جمیل الدین عاکی کے بارے میں تو میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔ میں نے بھی اپنا غزلیہ کلام زیادہ تر زار صاحب ہی کو دکھایا ہے کیونکہ نواب سائنس تو میرے کالج ہی کے دور میں انتقال فرما گئے تھے۔ نظمیں البتہ علامہ کیسے ہی کو دکھاتا تھا۔

علامہ زار صاحب کا فیضان یوں تو ۹۵ برس کی عمر میں کم از کم ۵ سال تمام ہندو پاک کے لاکھوں حضرات کو پہنچا مگر خود اُن کے گھر کا یہ عالم تھا کہ ہماری والدہ شاعر ہوئیں اور سب زار تخلص کرتی تھیں اور بعد کو سائنس صاحب کو کلام دکھانے لگی تھیں۔ پانچ بھائیوں میں سے تقریباً تین باقاعدہ شاعر ہوئے۔ پنڈت دیشا ناتھ زرتشی، آزاد و بسمل، رتن موہن ناتھ زرتشی خاں، اور نیاز مند۔ باقی دو بھی گرچہ اس مرض سے مطلق تو نہ بچ سکے مگر زیادہ عقلمند تھے، ساری عمر اس میں ضائع نہ کی۔

خوبصورتی میں سائنس صاحب کی طرح ۵۵-۵۴ تک بڑی بڑی طرح دار موٹھیں بھیں اور کلین شیو۔ دہلی والوں کا یہ کہنا ہے کہ راج اور زار کی جھلک جوڑی جدھر سے گزر جاتی تھی تو دور و بیہ زنانِ دہلی دیکھنے کھڑی ہو جاتی تھیں۔ سہ علم و مضمون پر غائر نظر رکھتے تھے۔ سات آٹھ زبان پر قدرت تھی۔ شہر بھر جھگوت گیتا۔ استادِ رگبتا

اور اودھت گیتا کا منظوم ترجمہ کیا اور کیڑوں کو کھلا دیا۔ تین لاکھ سے زائد شعر کہے جس میں سے اب
بمشکل کوئی دوسو تین سو غزلیں میرے پاس محفوظ ہوں گی بخصۃ بلا کا تھا۔ خواتین کے کالج
تک میں لڑکیوں کو بغیر برقع یا نیم عریاں اور تنگ لباس پہنا دیکھ کر ”دلی کی مخصوص زبان“
میں پھٹکار دیتے تھے۔ ساری دلی ملکہ سارا ملک ”مولوی صاحب“ کہتا تھا۔ اُن کے انتقال
پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب نے یہاں تک لکھ دیا کہ ”مجھے جیب کسی مسئلہ میں کوئی
اُلجھن ہوتی تھی تو میں مفتی کفایت اللہ اور مولوی پنڈت زار کے پاس اپنی تشنگی دور کرتے
جاتا تھا، یا پھر خواجہ عبدالمجید صاحب کے پاس محادروں کی صحبت کے لیے رجوع کرتا تھا،“
آخر میں اُن کی بھی داؤ غزلوں سے چند منتخب اشعار پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیں۔
میرے جوان ہونے سے پہلے جو جوان شاعری زار صاحب نے کی، پہلے اُس غزل کے دو چار
شعر ملاحظہ فرمائیں۔

پھلا پھولا گلِ زخمِ جگر ہے
سبیلِ آبِ یاری چشمِ تر ہے
لگی انگڑائیاں لینے جوانی
نہ آنچل کی نہ دامن کی خبر ہے
ہنہیں آنکھوں میں کوئی بھی سماتا
بہت اُدبچی تری نیچی نظر ہے
مکائی عمر بھر کی زارِ اپنی
یہی دے دے کے اک زخمِ جگر ہے

دوسری غزل جو اُن کا وہ اصل رنگ ہے جس میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۶۵ء تک میں نے
اُنہیں دیکھا، سنا اور سمجھا۔ فرماتے ہیں:

انا الحق جزوِ لانیفک بنا ہے میرے اِبقال کا
یہی ہے قلِّ هو اللہ اُحدِ مستوں کے قسراں کا
شفق سے شکر فی دامن ہوا چرخِ ستمِ راں کا
چھپائے سے نہ چھاپہ چھپ سکنا خونِ شہیداں کا

نہ صرف یہ کہ اس سے مل کر خوش ہوں گا بلکہ اس شاعرانہ طباعتی اور ذہانت کی داد بھی دوں گا لیکن افسوس باوجود کوشش اس شعر کے مصنف کا پتہ نہ چل سکا۔“ محمد علی خاں اُثرام پوری کہ یہ شعر سارا م پوری نے کہا تھا۔

دہلی اور لکھنؤ دونوں اُجر چکے تھے۔ نواب یوسف علی خاں نائظم اور پھر ان کے صاحبزادے نواب کلب علی خاں دونوں خود شاعر اور ادیب تھے اور مختلف فنون کے سرپرست تھے۔ اس لیے رام پور ایک اہم ادبی اور فنی مرکز بن گیا تھا۔ عربی، فارسی اور اردو کے عالم، فاضل، شاعر، ادیب اور فرسنگ نگار اس شہر میں جمع ہو گئے تھے۔ مختلف فنون کے ماہرین نے یہیں پناہ لے رکھی تھی۔ منشی احمد حسن خاں عروج، امیر احمد امیر مینائی، امیر اللہ نسکیم، حسین علی خاں شاداں، سید ضامن علی جلال، شیخ امداد علی بحر، منشی سید محمد اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی اور منشی مظفر علی اسیر وغیرہ جیسے شاعروں نے رام پور کو رشکِ دلی و لکھنؤ بنا رکھا تھا۔ شہر اور دربار میں طرحی مشاعرے ہوتے تھے جن کی وجہ سے شاعرانہ صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا موقع ملتا۔

مارچ ۱۸۸۱ء میں بے نظیر کا مشہور میلہ ہوا۔ نواب کلب علی خاں کے چھوٹے بھائی نواب حیدر علی خاں کی دعوت پر کلکتے کی ایک طوائف منی بانی حجاب بھی اس میلے میں آئی۔ جیسے ہی داغ کی اس پر نظر پڑی سودل سے اس پر قربان ہو گئے۔ داغ جب منی بانی کے عشق میں گرفتار ہوئے ہیں، تو ان کی عمر تقریباً اکیادہ سال تھی۔ تیس چوبیس سال مختلف نشیب و فراز کے ساتھ ان دونوں کے تعلقات رہے۔ ان تعلقات میں داغ کو سکھ کم دکھ زیادہ ملے۔ وفات سے ڈیڑھ دو سال قبل بہت نتیجوں کے ساتھ ان کے تعلقات ختم ہوئے۔

بہر حال داغ دنیا و مافیہا سے بے خبر عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے تھے کہ ۲۲ مارچ ۱۸۸۱ء کو نواب کلب علی خاں کا انتقال ہو گیا۔ نواب مشتاق علی خاں مسند نشین ہوئے۔ نواب صاحب اور ان کے مدارِ المہام اعظم الدین خاں کو شعر و سخن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان حضرات کا رویہ فنکاروں کی طرف بہت تغصنک آمیز تھا۔ ان لوگوں نے

الف الحمد کا تشقہ ہے میرے نورایمیاں کا
 بنا ہم رشتہ زُنارِ گلزارِ رگِ جاں کا
 بلا جو بے تمتا دلِ ازل میں اہلِ باطن کو
 وہی ہے دیرِ اترسا کا وہی کعبہ مسلمان کا
 الم نشرح ہوا سِرِّ خفی ہریانِ مستی میں
 یہ خمیازہ ہوا اے زارِ اپنے حال و جہاں کا

مختصر یہ کہ مولوی عبدالحق اور کفنی صاحب کے علاوہ داغ کے یہ چار دہلوی اساتذہ ہی
 وہ اہم استاد ہیں جن کے قدومِ میمنت لزوم میں بیٹھ کر اور جن کے سایہ عاطقت و
 شفقت میں ہم نے اکتسابِ علم و فن کیا اور دلی و اردو کا شعور و شعار حاصل کیا۔ غرض
 بخود شاعر۔ سائل اور زار ہی داغ کے وہ گلِ لالہ تھے جن کے سینے میں دلی کے گلشن
 ہزار رنگ کا داغِ لالہ روشن رہا جن سے ہزاروں نے اُسودگی و علم و فن حاصل کی۔
 آخر میں اپنے ان تین اشعار پر آج کی گفتگو کو ختم کرتا ہوں کہ سہ

زارِ صاحب تھے والدِ بوندہ
 اور سائل تھے میرے اَدل پیر
 زارِ دسائل کے ہی تو سَط سے
 میں ہوں نوابِ فیرزا کا نبیر
 میں ہوں گلزارِ داغ کا پوتا
 اور اردو زباں میری جاگیر

حاضرین مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں یومِ داغ کے ایک طرحی مشاعرے
 کی اپنی غزل کے بھی تین چار شعر اور پیش کرنے کی اجازت لے لوں۔
 عرض کرتا ہوں :

عشق کی منزلوں کے ہیں رہرو
 ہم نشیب و فرازِ کبیا جانیں

وہ جنون و خلل کے خبیث میں ہیں
 عشق کو چارہ ساز کیا جانیں
 لغزشوں میں ادا ہوئے سجدے
 ہم طریقِ نماز کیا جانیں
 کون مومن ہے کون کافر ہے
 رند یہ امتیاز کیا جانیں
 ہم سمجھتے ہیں داغ کو جی ہم
 ”آپ بندہ نواز کیا جانیں“
 یہ ہے گلزارِ جنتِ اُرو
 کم نظر و جسمِ ناز کیا جانیں

داغ کا دبستان شاعری

حضرات گرامی! جیسا کہ ابھی اعلان ہوا کہ میرے مقالے کا عنوان 'داغ کا دبستان شاعری' ہے۔ اس سلسلے میں کچھ کہنے سے پیشتر کہ داغ کے دبستان شاعری سے کیا مراد ہے لفظ دبستان کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور اس سے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دبستان کا لفظ ادب میں **SCHOOL OF THOUGHT** کے معنوں میں مستعمل ہے جس سے مراد طریق فکر اور اسلوب ادا کی وہ خصوصیات ہوا کرتی ہیں جو کسی خاص زمانے میں کسی خاص علاقے یا شہر میں رائج ہو جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ ایک ادارے یا ایک روایت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، اس کے پیچھے جو تاریخی تہذیبی اور معاشرتی محرکات کام کرتے ہیں، انہی کی روشنی میں اس روایت اور اس کی خصوصیات کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

ہم روایت کے طور پر یوں کہتے رہے ہیں کہ اردو شاعری کی تاریخ میں جسے دہلی کا دبستان شاعری کہا جاتا ہے اس کا آغاز وہی سے ہوتا ہے اور اختتام داغ کی شاعری پر ہوتا ہے لیکن اس کے یہ معنی ہر گز نہیں ہو سکتے کہ اس دور سے پہلے یا اس

دور کے بعد یہ خصوصیات مجموعی یا جزوی حیثیت سے دہلی کے علاوہ کہیں اور نہ پائی گئی ہوں اور نہ ہی اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ خصوصیات دہلی کے تمام شعراء میں یا ہر شاعری میں یکساں اور نمایاں حیثیت سے پائی جاتی ہیں بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ ان خصوصیات کا تعلق بحیثیت مجموعی دہلوی طرز فکر اور اسلوب ادا سے ہے جس میں بہت سے باہر کے لوگ بھی شریک ہیں اور جس کے دائرے سے خود دہلی کے بہت سے شعراء بھی نکلے ہوئے نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔ میں سید عابد علی عابد کی اس رائے سے مکمل اتفاق کرتا ہوں جو انھوں نے ذوق کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے دبستان لکھنؤ کے حوالے سے یوں دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

” لکھنؤی دبستان کے شعراء کے متعلق عام طور پر صاحب شعر الہند کی تقلید میں کہا جاتا ہے کہ ان کے یہاں خارجیت، صنعت گری اور استادیت تو ضرور نظر آتی ہے لیکن دہلوی دبستان کی سی نشتریت نہیں ملتی۔ لیکن میری رائے میں خارجیت لکھنؤ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ شاہ نصیر کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلوی شعراء بھی متقدمین کے اسلوب شعر گوئی کی طرف لوٹ رہے تھے اور صنعت گری اور مثنوی و استادیت کے نمونے پیش کر رہے تھے نیز لکھنؤی دبستان کی جو خصوصیات گنوائی جاتی ہیں وہ کم و بیش تمام دہلوی شعراء کے یہاں پائی جاتی ہیں فرق صرف کمیت کا ہے کیفیت کا نہیں اور ظاہر ہے کہ مدار امتیاز کیفیت ہوتی ہے کمیت نہیں۔“

یہاں میں اس امر کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارا شعری ادب اس حقیقت کا غماز ہے کہ شعوری طور پر نہ سہی لیکن غیر شعوری طور پر دبستان دہلی اور لکھنؤ کے اثرات ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہے ہوں گے فرق صرف وہی کمیت کا ہوگا کیفیت کا نہیں۔ اس لیے میرا ایسا خیال ہے کہ حتمی طور پر کسی شاعر کو کسی ایک دبستان یا ایک (SCHOOL OF THOUGHT) کی خوبیوں یا خامیوں سے نہیں جوڑا جاسکتا۔

اور نہ ہی کبھی ایسا ہوا کہ ایک دبستان ہمیشہ ہمیش کے لیے لکیر کا فقیر ہو کر کسی مخصوص طرز فکر یا اسلوب کی پیروی کرتا رہے بلکہ اخذ و استفادہ کی ایک غیر شعوری سطح ہو کرتی ہے جو نہ صرف ادب میں بلکہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں جاری و ساری رہتی ہے۔

دبستان کا تصور کسی تھیل یا تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح نہیں ہوتا بلکہ یہ عمل دریا کے بہتے پانی کی روانی کی طرح ہوا کرتا ہے۔ یہ روانی کبھی تیز ہو جاتی ہے اور کبھی دھبی پڑ جاتی ہے لیکن جاری رہا کرتی ہے۔ اگر کوئی فرد یا چند افراد شعوری طور پر اس عمل کو روکنے کی کوشش بھی کریں تو بھی زیادہ دیر اور زیادہ دن تک ایسا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی مثال اُن چند اشخاص کی سی ہوگی جو مکان کے کسی کمرے کے دروازے، کھڑکیاں اور روشن دان یہ سوچ کر بند کر دیں کہ باہر سے روشنی اور ہوا نہ آسکے مگر وہ کتنی دیر اور کتنے عرصے تک اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ ممکن ہی نہیں کہ اُن کا دم نہ گھٹے، حبس نہ ہو۔ سڑاند نہ پھیلے دروازہ کھولنا پڑے گا۔ دروازہ نہ سہی کھڑکیاں، کھڑکیاں نہ سہی روشن دان کھولنے پڑیں گے۔ زندہ رہنے کے لیے تازہ ہوا ضروری ہے۔

ادب اور اس سے متعلق تمام جزئیات کی نشو و نما میں بھی یہی عمل جاری رہتا ہے۔ انہی جزئیات میں شاعری بھی آتی ہے اور شاعری کی جزئیات بھی چاہے وہ طرز بیان ہو۔ اسلوب ادا ہو۔ موضوع سخن ہو۔ فکری سطح ہو یا معنوی سطح ہو۔ ادب اور شاعری کو شاداب رکھنے کے لیے پھلنے پھولنے کے لیے تازہ ہوا بھی درکار ہوگی اور نئی روشنی بھی۔

ادب میں لکیر کا فقیر نہیں بنا جاتا۔ کوئی بننا بھی چاہے تب بھی نہیں بن سکتا۔ کیسے ممکن ہے کہ اپنے پڑوس میں رہنے والے سے ملاقات نہ ہو، بات نہ ہو، چلے نہیں ملتے نہیں بات کرتے کیا آنکھوں پر مٹی بھی باندھ لیں گے، کہ وہ دکھائی نہ دے کانوں میں ٹیٹوئیاں ٹھوس لیں گے کہ اس کی آواز بھی نہ آسکے، منہ پر تالالگا لیں گے، کہ اُسے بھی ہماری آواز نہ سنائی دے۔ نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ نہ چاہنے کے باوجود بھی آپ اُسے دیکھیں گے، وہ آپ کو دیکھے گا، اُسے آپ کی آواز سنائی دے گی آپ کو اُس کی آواز سنائی دے گی اور اسے ہی اخذ و استفادے کے غیر شعوری عمل سے تعبیر

کیا جاسکتا ہے۔

ویسے بھی ادب کسی جامد شے کا نام نہیں ہوتا اور ہو بھی نہیں سکتا۔ شاعری کو جانے دیجئے خود اردو زبان ترقی و ارتقار کے نہ جانے کتنے مراحل سے گزری ہے، گذر رہی ہے اور گذرتی رہے گی۔ کیا شاعری ہو کیا نہ سب کے لیے ارتقار کا یہی اصول کار فرما ہے۔ کسی فن کار اور اُس کے فن کو کسی ایک خانے میں منقسم کر دینے کا عمل ہی آپ میں نہایت غیر مناسب ہوتا ہے پھر اُس فن کو اس مخصوص خانے کے چوکھٹے میں بٹھا بٹھا کر دیکھنے اور دکھانے کا عمل اور بھی زیادہ نامناسب ہوگا۔

کہنے والے کہہ دیتے ہیں کہ فلاں جگہ کے شاعروں کے یہاں صرف آمد ہے، داخلیت ہے، درون بینی ہے، سوز و گداز ہے اور فلاں اسکول کے شعراء کے یہاں آورد ہے، خارجیت ہے، لفظی بازی گرمی ہے، رنگینی ہے، ذہنی جناسٹک ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیجئے ہو گیا کام تمام جو لیل چسپاں ہونے تھے ہو گئے۔ اب اگر کوئی خدا کا نیک بندہ کہے کہ جناب آورد اور خارجیت والے ان شعروں کے متعلق کیا رائے ہے جو آمد اور داخلیت اور سوز و گداز والے شاعر کے یہاں سے برآمد ہوئے ہیں تو جواب ملے گا کہ یہ اُن کا اپنا رنگ نہیں ہے۔ حالات کی مجبوری نے اس رنگ کے اشعار شاعر سے کہلوادیئے۔ مگر جناب یہ آورد والے خارجی شاعر کے یہاں سے سوز و گداز اور داخلیت و سادگی کے شعروں کے متعلق جناب کا کیا فرمان ہے جواب ملے گا کہ اپنے اصلی رنگ سے بچھٹکے ہوئے ہیں، مزاج کے خلاف شعر کہے ہیں اسی لیے جان نہیں ہے۔ لیجئے صاحب قصہ تمام ہو فلاں فلاں شاعر یا شعراء، آمدی، داخلی اور سوز و گدازی قرار پائے اور فلاں فلاں خارجی، آوردی اور لفظوں کے بازی گر قرار دیئے گئے۔ اب اگر کسی نے یہ کہا کہ جناب آمدی و داخلی کے یہاں جناب خارجی اور آوردی کا رنگ بھی ملتا ہے اور جناب خارجی و آوردی کے یہاں حضرت داخلی اور آمدی کا رنگ بھی جھلکتا ہے تو صاحب آپ کیا اور آپ کی رائے کی حقیقت کیا۔

ہوایہ کہ ہمارے ادب کے مفتیوں نے اس ضمن میں اسقدر فتوے صادر فرمائے

کہ کسی شاعر کا الاٹمنٹ دبستانِ دہلی میں اس لیے ہو گیا کہ وہ دہلی میں پیدا ہوا یا پلا بڑھا پرورش پائی اور کسی کا دبستانِ لکھنؤ سے رشتہ طے کر دیا گیا کہ اس کی جائے پیدائش لکھنؤ یا اطرافِ لکھنؤ قرار پائی ہے۔ اس بات سے مطلب نہیں کہ وہ پیدا اگر اکبر آباد میں ہوا اور بارہ تیر سال بچپن کے وہاں گزارے۔ وہاں کی چھاپ اس پر کتنی پڑی۔ یا کوئی شاعر کن کن لوگوں سے متاثر ہوا وہ مقامی تھے یا غیر مقامی۔ اس کا اندازِ فکر کیا رہا۔ اُس کے معاشی حالات کا اس کی شخصیت اور شاعرانہ مزاج میں کتنا دخل رہا۔ اُس کے سماجی اور سیاسی ماحول نے اُس کی شخصیت کی تعمیر میں کتنا حصہ لیا، اُس کے خاندانی حالات نے اُس کی ذہنی تربیت کس نہج پر کی۔ اُس کے دوست احباب کون تھے اور وہ کس طرزِ فکر کے حامل تھے اس نے اُن کے کتنے اثرات قبول کیے۔ معاشی اور اقتصادی حالات کیا تھے۔ روزی، روٹی کی مجبوری نے شاعر کے ذہن اور قلم کو کتنا متاثر کیا۔ زندگی کا بیشتر حصہ کیسے گزارا۔ دار و رسن کی آزمائش میں یا کام و دہن کی ستائش میں۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات حاصل ہو جانے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ فلاں فلاں شاعر کسی خاص دبستان سے اتنا وابستہ نہیں جتنا کہ وہ خود اپنے آپ میں سراپا دبستان ہے۔ اس کی اپنی ذاتی زندگی کے تجربات و حوادثات، خاندانی حسب نسب، تعلیم و تربیت، اس کی ذہنی سطح، شعور کی رفعت و عظمت، خداداد صلاحیتیں، ایسے FACTORS ہیں جو سب میں منفرد ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جو گفتگو وجود میں آتی ہے جو تخلیقی عمل ہوتا ہے وہ اجتماعیت اور انفرادیت کا ملا جلا عکس پیش کرتا ہے البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ اس عکس پر کبھی اجتماعیت کا غلبہ ہو جاتا ہے اور کبھی انفرادیت کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اسی کے ساتھ زبان کے پیمانے بھی مختلف ہوتے ہیں ایک وہ زبان جو گھریا گھر کے ماحول سے ملتی ہے، دوسری وہ جو اطراف یا اطراف کے ماحول سے ملتی ہے تیسری وہ جو تعلیم و تربیت کے طویل حاصل ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ شخصیت کے اتنے بہت سے روپ زبان کی اتنی بہت سی سطحیں ہر فرد و بشر کے یہاں یکم از کم ہر بڑے تخلیق کار کے یہاں تہہ در تہہ موجود رہتی ہیں اور اس تخلیق کار کے تخلیقی عمل پر

اپنی تمام لطافتوں اور کثافتوں کے ساتھ ابھرتی اور سنورتی رہتی ہیں۔ موضوعات کے معاملے میں بھی کم و بیش یہی کہا جاسکتا ہے اور طرزِ بیان یا اسلوبِ ادا کے لیے بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جب یہ ساری چیزیں ہم آہنگ ہو کر لفظوں کا جامہ پہنتی ہیں تو شعر کے قالب میں ڈھلتی ہیں۔ ان سب رنگوں کے امتزاج سے جو رنگ پیدا ہوتا ہے اُسے کچھ بھی نام دیا جاسکتا ہے۔ دبستان بھی کہا جاسکتا ہے اور پہچان بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ پہچان یا دبستان انفرادی ہوتے ہوئے اجتماعی اثرات اور اجتماعی ہونے کے باوجود انفرادی اثرات کا مظہر ہوتا ہے۔

دبستان کے ذیل میں اس گفتگو کے بعد جب ہم داغ کے دبستانِ شاعری کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ادبی محاذ پر ہمیں داغ کا یہ کارنامہ نظر آتا ہے کہ انھوں نے دہلی کے اسلوبِ ادا، روزمرہ اور محاورات اور لکھنؤ کی رنگینیِ بیان کے مابین ہم آہنگی اور امتزاج پیدا کر کے ایک نیا رنگ ایجاد کیا۔ اسے پہچان داغ بھی کہا جاسکتا ہے اور دبستانِ داغ بھی اس پہچان یا دبستان میں تازگی بھی ہے اور نازکی بھی سادگی بھی ہے اور آلودگی بھی۔ وابستگی کے سامان بھی ہیں اور دل بستگی کے ارمان بھی۔ سرمستی بھی ہے اور سرشاری بھی، لطافت بھی ہے اور کثافت بھی، کوالف بھی ہیں اور لطافت بھی۔ مگر یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوا یا صرف داغ کے ذریعے ہی نہیں ہوا بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ زبان و بیان کی تاریخ کا یہ وہ ارتقائی سلسلہ ہے جس کا اثر غیر شعری طور پر صرف داغ ہی کا نہیں بلکہ داغ سے پہلے کا عہد بھی قبول کرتا چلا آ رہا تھا۔ کبھی کسی سطح پر سودا کے یہاں تو کبھی کسی رنگ میں شاہ نصیر کے یہاں یہ سب دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ سلسلہ ارتقاء جب آگے بڑھتا ہے تو اس کا ایک رُخ ناسخ یا شاگردانِ ناسخ کے یہاں جلوہ نما ہوتا ہے تو دوسرا رُخ آئین اور مصحفی، انشآء اور جرأت کے یہاں مختلف انداز سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ دہلی پہنچتا ہے تو ذوق کے یہاں اُن کے ڈھنگ سے، غالب کے یہاں اُن کے اپنے رنگ سے اور مومن کے یہاں اُن کے اپنے انداز میں رونمائی کرتا ہے۔ مگر داغ کا کمال یہ ہے کہ وہ ان دونوں رنگوں میں یا

ان سارے سلسلوں میں اس طرح ہم آہنگی پیدا کر دیتے ہیں کہ دونی کا امتیاز مٹ سا جاتا ہے، داغ نے اپنے کلام میں جس طرح دہلی کا روزمرہ، محاورات اور قلمی معلّٰی کی دودھ سے دھلی زبان کے ساتھ ساتھ دہلی کے گلی کوچوں اور عوام الناس کے لب و لہجے کو فارسی اور ہندی ترکیب کے ساتھ بچا کیا اور ساتھ ساتھ جرأت کی معاملہ بندی کو چھان پٹک کر یا دوسرے لفظوں میں مومن کی معاملہ بندی کی علمیت بھری خشکی کو چٹخارے اور زبان کی چاشنی دے کر لکھنؤ کی چٹ پٹی رنگینی بیان سے جس سلیقے کے ساتھ پیوند کاری کا عمل انجام دیا اس کی وجہ سے اسلوبِ ادا کی ایک نئی اکائی وجود میں آگئی اور جو صرف داغ ہی سے مخصوص ہو کر رہ گئی۔ یہ وہ مرکب اور ٹھیکھ اور دو زبان ہے جس کو کسی زبان سے پردہ نہیں اور کافی زمانے سے اپنے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرتے کرتے یہاں تک آ پہنچی کہ داغ نے اس کے تمام ممکنات کو بے نقاب کر دیا۔ اس مقام پر داغ کے شاگرد رشید احسن مارہروی کا یہ قول پیش کر دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا وہ لکھتے ہیں کہ

”اس وقت جو اردو رائج ہے اس کی امکانی ترقی اگر ہو سکتی ہے تو اتنی

ہی ہو سکتی ہے جتنی ۳۳ برس پہلے فصیح الملک داغ کی بدولت ہو چکی ہے۔“

مذکورہ بالا بیان عقیدت مندی پر نہیں بلکہ حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔ غالب کی دور رس اور دور میں نگاہ نے بھی اپنی عمر کے آخری حصے میں اسی حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ مستقبل میں داغ کے دبستانِ اسلوب یا شاعری ہی کا بول بالا ہو گا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اکثر داغ کے کلام کی تعریف کی ہے آئینہ داغ میں نثار علی شہرت داغ کے متعلق غالب سے ہوئی گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”دہلی والوں کی جو اردو ہے جس کو مشک و عنبر کہنا چاہئے، اس کو ہی

اشعار میں لکھنا چاہئے۔ آخری عمر میں ہماری تو یہی رائے قائم ہوئی ہے۔

میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی کہ داغ کی اردو کیسی ہے۔ فرمانے لگے

ایسی عمدہ کہ کسی کی کیا ہوگی۔ ذوق نے اردو کو اپنی گود میں پالا تھا۔ داغ

اس کو نہ فقط پال رہا ہے بلکہ اُس کو تعلیم دے رہا ہے۔“

اس سلسلے میں خود داغ کے بیان کو بھی پیش نظر رکھنا از حد ضروری ہے۔ داقتباس از آئینہ داغ (راوی نثار علی شہرت۔ (ص ۲۲)

”ایک روز میں نے داغ سے کہا کہ میں نے اپنے آپ کو شاعر نہیں بنایا دگو طبیعت نامہ ادشاعرانہ رکھتا ہوں) اگر مجھ کو فرصت ہوتی تو ایسا شاعر بننا جیسا کہ آپ بنے ہوئے ہیں، میں اپنی نظموں سے قوم کی رہنمائی کا کام لیتا، نہ فقط یہی۔ بلکہ پولیٹیکل اور سوشل کے دقائق کو نظم کا لباس پہنتا تھا۔۔۔۔۔ داغ صاحب نے میری تقریر کو غور سے سنا اور فرمایا دوست تم سچ کہتے ہو لیکن کیا کروں ایک کام اپنے قسمے لیا ہے وہی پورا نہیں ہوتا میں نے کہا وہ کام کیا ہے؟ فرمانے لگے جس طرح کان سے جواہر نکلتے ہیں اسی طرح قلعہ معلیٰ اور دہلی میں سے اردو زبان نکلی ہے جس کے محاورے لال ویا قوت کو پرے بٹھاتے ہیں۔ میں کوشش یہ ہے کہ دہلی کی شمشاد و رقتہ زبان تمام ہندوستان میں پھیل جاوے اور ہر شہر میں ایسی ہی اردو بولی جاوے جیسی کہ دہلی میں بولی جاتی ہے۔“

اس بیان کی روشنی میں تین باتیں واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ شاعری کے نقطہ نگاہ سے داغ کے لیے زبان کا کیا مطلع نظر تھا۔

دوسرے یہ کہ قلعہ معلیٰ کی اردو اور محاورات و روزمرہ کی افادیت و اہمیت سے

داغ کس قدر باخبر تھے۔ اور

تیسرے یہ کہ اُنھوں نے اس زبان اور ان محاورات کو اپنی شاعری کے ذریعے

ملک کے گوشے گوشے میں پھیلانے کا عزم کیا ہوا تھا۔

اسے ہم ان کی لگن سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں اور مشن سے بھی یوں تو محاورات اور

روزمرہ کو شاعری یا اسلوب ادا کا ذریعہ بنانا اُس عہد میں عام تھا لیکن صحت اور

صفائی کے ساتھ محاورات کی اتنی بڑی تعداد کو شعر کی زبان میں کھپا دینے اور برت

داغ کو ملازمت سے نکالایا داغ خود مستعفی ہوئے یہ تحقیق طلب ہے بہر حال داغ رام پور چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

داغ تقریباً گیارہ سال نواب رام پور کی ملازمت میں رہے۔ اس دوران میں وہ دہلی تو جاتے رہے ہوں گے۔ لیکن فرائض منصبی کی وجہ سے کسی اور شہر جانے کا موقع نہیں ملا۔ ایک بار اپنی محبوبہ منی بانی حجاب کے بے انتہا اصرار پر کھلتے گئے۔ راستے میں کچھ دن، پٹنہ میں قیام کیا اور کچھ دن کھلتے رہ کر رام پور واپس آ گئے۔

اب جو رام پور سے ملازمت ختم ہوئی تو دلی آئے اور کچھ دن بعد مختلف شہروں کی سیاحت میں مصروف ہو گئے۔ داغ نے لاہور، امرتسر، ریاست کشن کوٹ، اجیر، شریں آگرہ، بنگلور، علی گڑھ، متھرا، بے پور اور ریاست منگروول کی سیر کی اور وہاں اپنے شاگردوں اور مداحوں سے ملاقاتیں کیں۔

نثار علی شہرت نے آئینہ داغ "میں لکھا ہے کہ جب کشمیر میں رینڈی ٹی بیٹھی اور انتظام میں تبدیلی آئی تو مستعفی ہو کر دہلی آ گئے۔ کچھ دن دہلی رہ کر وہ اپنے عزیز دوست مولوی سیف الحق ادریب (شاگرد غالب) کے پاس حیدر آباد چلے گئے۔ ایک دن شہرت ادریب کو خیال آیا کہ داغ رام پور سے استعفیٰ دے کر دہلی میں مقیم ہیں اگر انھیں حیدر آباد بلایا جائے تو روزگار کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ مولوی سیف الحق نے ارکان ریاست سے مشورہ کر کے داغ کو خط لکھ کر حیدر آباد بلایا۔ ابتدا میں داغ حیدر آباد آتے ہوئے جھکے، لیکن ادریب کے اصرار پر بالآخر مان گئے۔ یہ قول داغ انھیں حیدر آباد بلانے میں ریاست کے ایک امیر خاں ماں ابراہیم علی کا ہاتھ بھی تھا۔ مولوی سیف الحق بازار سعدی غبر میں رہتے تھے، انھوں نے اپنے گھر کے قریب ہی داغ کے لیے ایک مکان کرایے پر لے لیا۔ داغ، رام پور میں سلسلہ کو حیدر آباد پہنچے اور اس مکان میں اترے۔ حیدر آباد کے ادب نوازوں نے ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور زبردست پذیرائی کی۔ داغ کی نظریں محبوب علی خان نظام دکن کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جب ادھر سے کوئی سلسلہ جنبانی نہیں ہوئی تو خود داغ راجا گردھاری پرشاد عرف بتسی راجا المتخلص بہ باقی کی معرفت پیش گاہ سلطانی

جانے میں داغ اپنے تمام معاصرین سے ممتاز ہیں ان سے انھوں نے اپنے کلام میں شیرینی اور اسلوب میں رنگینی پیدا کی۔ لہجے میں یانکین اور تیور پیدا کیے۔ فصاحت و بلاغت کے جادو جگائے روانی اور بے ساختگی کے جوہر پیدا کیے۔ ولی احمد خاں نے بقول محمد علی زیدی داغ کے دواوین سے چار ہزار چار سو چونتھ محاورات اخذ کیے ہیں۔ اسے ان کی مشافی استادی اور زبان دانی کا کرشمہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے محاورات ان کے اشعار کے قالب میں ڈھل کر ضرب المثل بن کے زبان زدِ خاص و عام ہو گئے۔ مثال کے لیے صرف چند پر اکتفا کروں گا۔

حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے	ع
تو نہیں اور نہ ہی اور نہیں اور نہ ہی	ع
آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں	ع
ذکر حبیب کم نہیں وصل حبیب سے	ع
جہاں نکلتے ہیں تقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں	ع
ہر روز کی چھک چھک سے مراناک میں دم ہے	ع
بندہ پرور منصفی کرنا خدا کو دیکھ کر	ع
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے	ع
ہائے کجخت تو نے پی ہی نہیں	ع

یہ بات کہنے سے یہاں یہ مذکور ہے کہ داغ نے جو یہ مشن اپنایا تھا وہ نہ صرف یہ کہ ان کے وقت کا اہم تقاضہ تھا بلکہ اُس کے نتائج بھی بہت دور رس تھے۔ اس لیے کہ داغ کے دبستان کے اسلوب کو بہر حال مستقبل کے شاعرانہ اسلوب کے لیے نشانِ منزل بننا مقدّر ہو چکا تھا۔ اپنی شاعری کے ذریعے وہ یہ اہم منصب بھی انجام دے رہے تھے اور اپنے شاگردوں کی تربیت بھی انھوں نے اس طرح کی تھی کہ ان کے محفّی جوہروں کو مستقبل کے لیے ابھار دیا تھا۔ اس طرح ایک نئی شعری روایت کی بنیاد قائم ہو گئی تھی۔ یہی وہ شعری تربیت تھی جس کا ایک پہلو اپنے پورے یانکین کے ساتھ مسائل، آزار

بیخود اور آغا شاعر کے یہاں نمودار ہوا اور دوسرا پہلو جدید شاعری کی قوتِ بیانیہ کا روپ دھار کر اقبال کے یہاں روتا ہوا۔ روایتِ شعری کے تمام علائم و رموز کا محلِ استعمال اقبال نے داغ سے ہی حاصل کیا اور یوں عصرِ حاضر کا سب سے بڑا سخن طراز جن کے کلام میں علائم و رموز کا گراں بہا ذخیرہ موجود تھا داغ ہی کامرہوں منت ٹھہرا۔ اپنے معاصروں کے مقابلے میں شعری عظمت شاید داغ کے یہاں کم ہو لیکن اس کی شعری تربیت شعری اسلوب اور شعری دبستان کا فیضانِ عالم اور دنیا دُنیا پہنچا ہے اقبال کا اثر برصغیر کے تمام دانشوروں اور شاعروں پر نمایاں ہے کہا جاسکتا ہے کہ صرف داغ ہی کو یہ سعادت حاصل ہے کہ اس کا دبستانِ شاعری فیضِ رسانی کے اعتبار سے تمام دبستانوں سے سبقت لے گیا ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ داغ کے زمانے میں شاعرانہ اور ادبی شخصیت یوں جا بچی اور پرکھی جاتی تھی کہ اس کے شاگرد بھی اس کی تخلیق ہی سمجھے جاتے تھے گویا ناقدینِ ادب شاعر کو اس نقطہ نظر سے بھی دیکھتے تھے کہ اس کا فیضان کہاں کہاں تک پہنچا ہے، داغ کے دبستانِ شاعری کو سمجھنے کے لیے یہ بات اصولی طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ اپنی شاعری کے علاوہ اپنے شاگردوں کے ذریعے وہ جس طرح اردو ادب پر اثر انداز ہوئے یہ اُن کی خلاق فعالیت کا کرشمہ ہے، ہم یہ بات اس لیے فراموش کر دیتے ہیں کہ آج اُستادی شاگردی کا کلاسیکی سلسلہ درہم برہم ہو گیا ہے اور شعری خانوادوں کی اہمیت نظر سے اوجھل ہو گئی ہے۔

داغ کے دبستانِ شاعری کے قبولِ خاطر خاص و عام ہونے کی حد یہ تھی کہ لکھنؤ اسکول کے نمائندہ — امیر، امیر، متیر، تیر، اور قلی جیسے شعراء نے بھی اپنی ڈگر بدلی اور اپنے شاعرانہ اسلوب میں داغ کے شاعرانہ اسلوب کی پیوند کاری کی کوشش کی گو وہ ناکام رہے۔ یہاں کہنے کا مائدِ عاصرت یہ ہے کہ داغ دبستان کا اثر اس عہد کی نئی نسل پر ہی نہیں بلکہ ان کے معاصروں اور ہم عمروں پر بھی پڑا۔ بالکمالِ اساتذہ نے بھی اپنی شاعری کے لیے قبولیِ عام کی سند حاصل کرنے کی خاطر اسلوبِ داغ ہی کو اپنانے میں اپنی عافیت جانی — عالم یہ ہے کہ ان بالکمالِ اساتذہ کی روش کو دیکھ کر خود ان کے شاگرد بھی

اسی روش پر چل نکلے اور دیکھتے ہی دیکھتے جلیل مانک پوری، حفیظ جون پوری اور ریاض خیر آبادی جیسے ہنرمند شاعر بھی داغ کے رنگ میں رنگنے لگے۔ اُدھر شاگردانِ داغ کی تعداد کا یہ عالم ہوا کہ یہ تعداد دس بیس یا سو پچاس پر ختم نہیں ہوئی کئی سونک جا پہنچی اور اگر نور اللہ محمد نوری کی رائے کو سچ مان لیا جائے تو یہ تعداد پانچ ہزار سے زائد ہو گئی تھی۔ لیکن اس تعداد کو اگر سچ بھی نہ مانا جائے تب بھی لوحِ ناروی کے بیان کے مطابق یہ تعداد دو ہزار کے لگ بھگ سمیٹتی ہے۔

یہ داغ کے دبستانِ شاعری ہی کی دین ہے کہ حالی جیسے شاعری کے نبضِ وقت نے بھی یہ بھانپ لیا کہ مستقبل میں شاعرِ ما کے ذریعے وہ جس مشن کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں اور اس کے لیے جو معیارِ سخن انھوں نے مقرر کیا ہے وہ موضوعات یا صنفِ شاعری کے اعتبار سے چاہے داغ کی شاعری سے میل نہ کھائے لیکن اسلوبِ ادا کی سادگی اور عام فہم زبان کی چاشنی کے اعتبار و معیار پر ضرور پوری اترتا ہے۔

اُدھر جدیدِ نثر پر بھی اس اسلوب کی چھاپ بڑی آزاد جیسے انشا پر داز نے آبِ حیات میں اس اسلوب کو نثری قالب میں ڈال کر خوب جادو جگائے ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے درست کہا ہے کہ "آزاد کی مرصع زبان بھی ذوق سے داغ تک کی نثری اور نظمیں صدائے بازگشت ہے اور حالی کی نریادِ بیوہ کی مٹھاس اور لوح بھی اسی زبان کی ایک سطح ہے۔" یہی باتِ نذیر احمد کے لیے بھی

کہی جاسکتی ہے اور یوں جدید اردو نثر کا وہ پودائیں کا بیج غالب نے لگایا، داغ کے ہاتھوں پلا بڑھا اور حالی و نذیر احمد کے ہاتھوں پہنچے پہنچے پھل پھول دینے لگا۔ مگر ساتھ ہی یہ اعتراف لازم ہے کہ داغ کے کلام کی معنوی سطح پر وہ عظمت نہیں ہے جو غالب، مومن یا کسی حد تک ذوق کے یہاں نظر آتی ہے۔ لیکن جو چیز داغ کے یہاں بدرجہ اتم نظر آتی ہے وہ ہے شعر کا تفریحی پہلو جو اس وقت کے پیشِ نظر ضروری بھی تھا اور قدرتی بھی۔ کیونکہ عذر کی ناکامی سے دل خون ہو گئے تھے۔ روئیں کچلی گئیں تھیں۔ آرزوئیں اور تمنائیں تقریباً موت کی نیند سو گئی تھیں اور زندگی میں زندگی باقی نہ

رہی تھی۔ ہر طرف پریشانی، نا اُسودگی اور بے حالی کا بازار گرم تھا۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں داغ کی زبان و بیان کی شاعری اور داغ روندی ہوئی مخلوق کے لیے مسیحا ثابت ہوئے اور اردو شاعری کے لیے عیسیٰ نقض — حالانکہ اردو شاعری کی فکری تجدید کا عمل جو غالب کے بعد رک گیا تھا۔ اقبال کے ہاتھوں پورا ہوا کیونکہ اقبال کو گرد و پیش کے حالات، افتادِ طبع اور غیر ملکی قیام و تعلیم سب کچھ معاون ثابت ہوئے تھے۔ سوچتے کی بات یہ ہے کہ اس زندگی کش دور میں اردو شاعری کو داغ جیسا شاعر نہ ملتا تو یہ شاعری زندہ بھی رہتی یا نہیں اور اگر زندہ رہتی بھی تو کس حال میں زندہ رہتی۔ کیونکہ اتنی بات تو صاف ہے کہ شاعری کی اساس، جذبات و احساسات ہوتے ہیں اور جب تک انسان کا وجود ہے۔ یہ جذبات و احساسات باقی بھی رہیں گے اس لیے داغ کی شاعری کا مطالعہ داغ کی زندگی کے چوکھٹے میں رکھ کر ہی کیا جانا چاہئے۔ کیونکہ داغ وہ شاعر ہے کہ جب تک ہم اُس کی زندگی کے پیچ و خم سے آگاہ نہ ہوں گے اس کی شاعری کی بنیادوں سے واقف نہیں ہو سکتے بلکہ ہلکے پھلکے جذبات، رنگ و رنگ خیالات لطیف دلکشیاں اور رنگین دلچسپیاں کیفیت و طرب اور نشہ لیے سرمستیاں جو دبستانِ داغ کی جان ہیں اور جن میں غنائیت ہے ان معنوں میں تعمیری بھی ہیں اور افادی بھی کہ اس شاعری نے ہر آشوبِ عہد کے آشوب زدہ لوگوں کے دل و دماغ کی جلن کو بھگم کیا کیونکہ اس میں نفع کم اور اصلیت زیادہ تھی ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ دلوں کی تپتی اور سلگتی ہوئی زمینوں سے آہ کے بجائے واہ نکلتی۔ شروع سے آخر تک ”شہر آشوب“ کے وقفے سے قطع نظر جو نہ جانے اُن کی کونسی کسک کا نتیجہ بن کر سامنے آگیا۔ داغ واہ کے شاعر ہے اپنی زندگی میں بھی واہ بھردی اور دوسروں کی آہ کو بھی واہ بنا دیا اُنھیں تمام عمر اسی واہ سے دلچسپی رہی اُن کی فریادِ داغ بھی اصل میں تو واہ ہی کی تعبیر ہے یہ بات اُنک ہے کہ اُسے آہ کا جامہ دیدیا گیا ہے۔ پھر عشق کی آہ میں بھی تو واہ ہی ہوتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ

”فریادِ داغ بھی ایک معنی میں سرگزشتِ نشاط ہی ہے جو غزل کے بجائے

مثنوی کے سانچے میں ڈھل گئی ہے ظاہر ہے کہ فریاد نام رکھ دینے سے کوئی
شے فریاد تو بن نہیں جاتی۔ اس کے لیے خونِ دل و جگر کی ضرورت ہوتی ہے
اور یہ خونِ دل اُن کی فریاد میں اس لیے کم منتقل ہوا ہے کہ وہ عموماً بامراد
عاشق رہے ہیں۔“

وہ ہر جائی اگر ہے داغ، ہو تم بھی تو آوارہ
تمہیں کب صبر ہے بیٹھے ہوئے تم ایک پر کیا ہو

وہی جھگڑا ہے فرقت کا، وہی قصہ ہے الفت کا
تجھے اے داغ کوئی اور بھی افسانہ آتا ہے
دن گزارے عمر کے انسان ہنستے بولتے
جان بھی نکلے تو میری جان ہنستے بولتے

پا
پوچھتے کیا ہو، کیوں لگائی دیر
اک نئے آدمی سے ملنا تھا

پا
اللہ اللہ رے تری شوخ بیانی اے داغ
مست اک شعر نہ دیکھا ترے دیوان میں کبھی

یا
ہائے وہ دن کہ میسر تھی ہمیں رات نئی
روز معشوق نیا، روز ملاقات نئی

ہم ایک کے پابندِ محبت نہیں ہوتے
ہے رنگِ طبیعت کا، کہیں اور کہیں اور

ذرا ڈاکٹر مسیح الزماں کا یہ بیان بھی سن لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ
 ”داغ کی شاعری میں جو چو نچال پن ہے وہ زندگی کے نشاطیہ عناصر
 کو ابھارتا ہے مغموم آدمی کا دل بھی ان کو پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے شگفتہ
 ہو جائے۔ اردو غزل میں یاس و نامرادی کی فراوانی میں ان کے اشعار
 ایسا نخلستان ہیں جہاں خوش حالی کی دھوپ ہے، بے فکری کے چھینٹ
 اڑتے ہیں۔ لگاؤ کے اشارے ہیں۔ بے تکلفی کی گدگدیاں ہیں ان میں
 عشق کی گہرائی یا سوز نہیں ہے گہرے لگاؤ کی سنجیدگی اور مسرت نہیں
 لیکن زندگی کا ایک پہلو یہ بھی تو ہے کہ قوس قزح لہرائے اور نکل جائے
 کھلکھلاتا ہوا پھول جھکے اور لچک کر سرک جائے۔“

سب ہی نقاد قریب قریب یہی کہتے ہیں۔ اگرچہ کوئی کسی پھر سے کہتا ہے اور کوئی کسی پھر سے
 سب داغ کے کلام میں عیش و عشرت کا پاس دیکھتے ہیں۔ سب کو معطر گیسوؤں کی تہک
 آتی ہے۔ سب رنگین لباس اور حسین جامہ زیب کی بھڑک محسوس کرتے ہیں۔ سب کی
 آنکھیں جلوۂ جاناں سے بس جاتی ہیں۔ کسی کو تو شوخی اور رنگینی میں ابتذال اور عامیانہ
 پن بھی دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ اگرچہ یہ ابتذال اور عامیانہ پن اب محسوس ہوتا ہے یقیناً
 اس زمانے میں ابتذال یا عامیانہ پن نام کی کوئی چیز ان کے کلام میں نہ سمجھی جاتی ہوگی
 کیوں کہ وہ زمانہ ہی ایسا تھا اس وقت کا سماج اور اس دور کی سوسائٹی ایسی ہی
 تھی کہ جسے ہم آج ابتذال اور عامیانہ پن کہہ کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ وہ شوخی اور رنگینی
 سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ غزل کے اشعار داغ کے زمانے تک سینکڑوں انداز کے تیوروں سے
 مزین ہو چکے تھے۔ کیا نہیں تھا ان میں سب کچھ ہی تھا۔ ایک اشارے، ایک انداز سے
 جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا جاتا تھا۔ داغ نے ان سب کے باوجود ان میں اضافہ کیا اور
 ان تیوروں کو اور زیادہ لطیف اور تیز تر بنادیا گویا کئی تیور تو ایسے ہو گئے جیسے
 مضراب یا زخمہ کہ ابھی ساز کے تاروں سے دور ہی ہیں اور تار جھنجانے لگے اور فضاؤں
 کو گنجا دیا اور کانوں کو بسا دیا۔ یہ تیور اور یہ تکیہ پان اور کہیں نہیں، یوں داغ کی شاعری

شعر لطیف اور تیکھے تیوروں کی کھان ہے ان تیوروں کو تیکھا اور تیر انداز بنانے کے لیے
 داغ نے اگر ایک طرف اسلوبِ ادا کی جلوہ نمایوں کو مطمح نظر بنایا تو دوسری طرف
 اسلوبِ ادا میں تیور اور تیکھا پن پیدا کرنے کے لیے قلعہ معلیٰ کی زبان سے سے سے کمر
 جاب بانیا یا حجاب جان کے کوچے کی زبان کو بھی روار کھا اور ان دونوں کو ایک
 دوسرے سے ہم آہنگ کر کے دہلی اور قلعے کے روزمرہ اور محاورات سے ایسا رنگ
 چڑھایا جو نہ ان سے پہلے اور ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ نہ ان کے بعد ان جیسا کسی
 اور نے وہ رنگ اختیار کیا یا یوں سمجھ لیجئے کہ اختیار کرنے کی کوشش بسیار کے باوجود
 بھی اختیار نہ کیا جاسکا۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دلی اسکول
 اور لکھنؤ اسکول جیسی بات زیادہ سے زیادہ داغ کے اوائل زندگی تک ہی رہی، پھر
 تو صرف کہنے کی بات رہ گئی تھی یا رہی بھی تو کچھ نمایاں نہیں۔ صرف برائے نام ہی تھی
 کیونکہ داغ کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ یہ آبنائے پٹی چلی گئی اور ہر طرف ہندوستان
 بھر میں ایک ہی اسکول کے اثرات پھیل گئے۔ اغلباً وہ دلی اسکول تھا نہ لکھنؤ اسکول
 کوئی اور ہی اسکول کہنا اسے مناسب ہوگا۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ داغ کے اتنے طویل
 عرصے تک باہر رہنے اور حیدرآباد میں ایک زندگی گزارنے پر بھی وہی دلی اسکول رہا
 جو ان کے قلعہ معلیٰ میں یا دلی میں رہتے ہوئے رہا تھا۔ حقائق تو اس کے خلاف جلتے
 ہیں اور قیاسات بھی ساتھ نہیں دیتے۔ یوں خواہ کچھ بھی کہہ لیا جائے ماحول، حالات،
 گرد و پیش اور صبح و شام کے اثرات برس دو برس، دس برس، بیس برس نہ ہوں تو نہ
 ہوں لیکن یہ کیسے مان لیا جائے کہ زندگی زندگی بھر کی عمر میں مختلف مقامات پر گزارنے
 کے بعد بھی کوئی اثر، کوئی تبدیلی اور کوئی تیور کسی انداز سے بھی نہ آئے۔ پائے۔ یقیناً
 داغ اسکول دلی اسکول نہ رہ سکا ہوگا، کچھ نہ کچھ ضرور نکھرا یا بگڑا ہوگا اور کوئی نہ کوئی
 اختلاف یا فرق ضرور نمایاں ہوا ہوگا۔

داغ معجز بیباں ہے کیا کہتا
 طرز سب سے جدا نکالی ہے

داسغ سا بھی کوئی شاعر ہے ذرا سچ کہنا
جس کے ہر شعر میں ترکیب نئی بات نئی

نہیں ملتا کسی مضمون سے ہمارا مضمون
طرز اپنی ہے جدا، سب سے جدا کہتے ہیں

داسغ کی زندگی کے مطابق اُن کا کلام بھی تین دور یا تین حصّوں میں الگ الگ کیا جاسکتا ہے۔ نمبر ۱۔ قلعہ معلّیٰ کا کلام جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بہت کم باقی رہ سکا لیکن قیاس ہے کہ سب کا سب نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور باقی رہا ہوگا جو الگ نہ رہ سکا ہو تو رام پور کے کلام میں شامل ہو گیا ہو۔ نمبر ۲۔ رام پور کا کلام اور نمبر ۳۔ حیدر آباد کا کلام ——— رام پور اور حیدر آباد کے کلام چاروں دیوان میں موجود ہیں۔ ——— حیدر آباد کا کلام رام پور کے کلام سے الگ ہے۔ ان دونوں مقامات کے کلام میں وہی فرق ہے جو جوانی اور بعد جوانی یا بڑھاپے میں ہوتا ہے۔ چونکہ داسغ کا شوخ و شنگ اور رنگین و طرار کلام جوانی کا تقاضہ کرتا ہے اور جوانی کی فضاؤں میں ہی پیتا اور پھولتا ہے۔ اس لیے اُن کا رام پور کا کلام ہی اُن کی معراج سخن تصور کیا جاسکتا ہے، ہاں حیدر آباد کے کلام میں فنی اور شعری پختگی بڑھی ہوگی جسے رام پور کی نسبت زیادہ قابلِ رضا قرار دیا جاسکتا ہے۔

خلاصہ مطلب کے طور پر اختتام میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دبستانِ داسغ کی شاعری اُس اکائی کا نام ہے جسے داسغ نے دہلی اور لکھنؤ کی آمیزش سے پیدا کیا اور بالآخر یہ اکائی مختلف اجزاء سے مل کر وحدتِ تالیفی کی صورت میں جلوہ گر ہوئی جس نے آگے چل کر جدید اردو شاعری کے لیے وہ زرخیز زمین ہموار کی جس پر آج ہماری شاعری کی بنیادیں استوار ہیں اور برصغیر کے گوشے گوشے میں اس دبستان کا فیض آج بھی جاری و ساری ہے۔

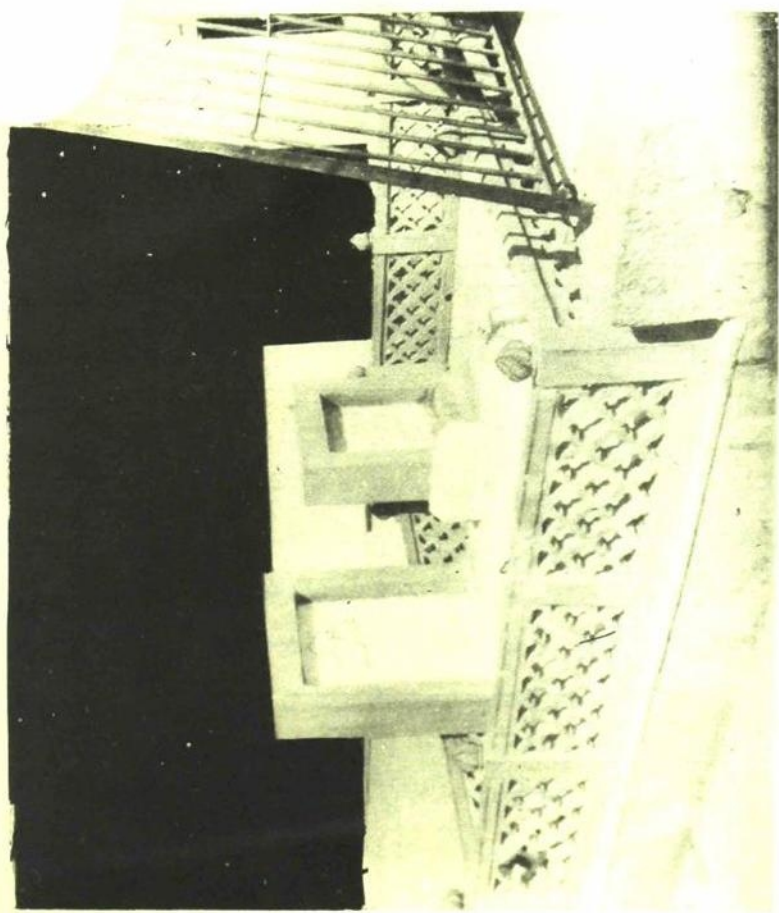
شب وصل ایسی کھلی چاندنی
وہ گھبرا کے بولے سحر ہو گئی

راہ میں ٹوکا، تو جھنجھلا کر کہہا
دور ہو کم بخت یہ بازار ہے

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا
نمازات قیامت کا انتظار کیا

آپ کے سر کی قسم داغ کو پرواہ بھی نہیں
آپ سے ملنے کا ہو گا جسے ارماں ہو گا

جو گذرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں



عرضی گزرنی۔ نظام نے فوراً دربار میں بلایا۔ داغ نے قصیدہ پڑھا۔ واہ واہ ہوئی اور بات ختم۔

اسی طرح سو سال گزر گیا۔ داغ جو رقم اپنے ساتھ لائے تھے، وہ ختم ہو گئی؛ اگرچہ ابھی تک نظام کے دربار میں ملازمت کا کوئی سلسلہ نہیں بنا۔ اس لیے داغ مجبوراً ۱۲ جولائی ۱۸۹۹ء کو حیدرآباد سے روانہ ہو گئے۔ بنگلور اور ممبئی ہوتے ہوئے دہلی پہنچ گئے۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران داغ کے چھ ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ روپے تو ایک مکان رہن رکھ کر حاصل کیے تھے اور کچھ روپے دوستوں سے قرض لیے تھے۔ نظام کو جب معلوم ہوا کہ داغ مالوس ہو کر دہلی چلے گئے ہیں تو انھوں نے وقار الامراء سے خط لکھوا کر داغ کو واپس بلوایا۔ حیدرآباد جانے اور ملازمت ملنے تک کے قیام کے اخراجات کے لیے داغ نے اپنا ایک مکان بیچا۔ ۲۹ مارچ ۱۸۹۹ء کو دہلی سے روانہ ہو کر قیسری یا چوٹھی اپریل ۱۸۹۹ء کو داغ نئی امیدوں کے ساتھ حیدرآباد پہنچ گئے۔ پہلی دفعہ جب داغ حیدرآباد آئے تھے تو مولوی سیف الحق ادیب کے مکان کے قریب ایک مکان میں رہے تھے۔ کچھ ہی عرصہ بعد داغ کے ایک دوست مولوی ظہور علی، جو ٹاڈہ کے رہنے والے تھے اور وکیل ریاست حیدرآباد تھے، انھیں اپنے مکان میں لے آئے تھے۔ اس دفعہ جب داغ حیدرآباد آئے تو اس مکان میں اترے۔ یہ مکان افضل گنج میں تھا۔ یہ مکان بہت تنگ تھا۔ جب ملازمت مل گئی شان و شوکت میں اضافہ ہوا، تو یہ مکان ان کے قابل نہیں رہا۔ انھوں نے تپ بازار میں ایک کوٹھی کرائے پر لے لی اور باقی زندگی، اسی کوٹھی میں گزاری۔

حیدرآباد کے دربار سے منوسل ہونے کی داستان خود داغ کی زبانی سنئے:

”لیکن یہاں پہنچ کر پھر ایک برس گزر گیا اور کوئی شغوائی نہ ہوئی نیز اہل پھر اچاٹ ہوا، پھر اعلیٰ حضرت کے بعض مصائبین کی خدمات میں معروضات پیش کیے اور کہا کہ میں جاتا ہوں، ایک روز کا ذکر ہے کہ میں اپنے مکان کے برآمدے میں بیٹھا تھا کہ میرے سامنے سے اعلیٰ حضرت کی سواری نکلی۔

صدر میں اعلیٰ حضرت جلوہ فرما تھے۔ پائیں میں دو مصاحب تھے۔ جس وقت میرے مکان کے قریب سواری پہنچی، میں جیسا کہ یہاں کا دستور ہے تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا اور سلام کیا۔ شاید اعلیٰ حضرت نے سلام لیا ہو، یہ میں نہیں دیکھ سکا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ داغ کیوں جاتے ہیں۔ دس پندرہ روز کے بعد معلوم ہوا کہ چار سو روپے کا منصب اعلیٰ حضرت نے میرے واسطے مقرر فرمایا ہے۔ یہ خبر عام طور سے مشہور ہو گئی۔ لوگ مجھے مبارک باد دینے کے لیے آئے لگے۔ میں نے جب اعلیٰ حضرت کے بعض مقرّبین سے دریافت کیا تو انھوں نے بھی اس امر کی تصدیق کی، لیکن اس واقعے کو بھی ایک سال گزر گیا اور ہنوز دتی دور است کے مصداق کچھ نہیں۔ ایک دفعہ میں وقار الامرا سے ملنے کے لیے گیا۔ انھوں نے اعلیٰ حضرت کی ڈیوڑھی میں ہی مجھے بلالیا۔ میں وہاں ایک گاڑی پر پہنچا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سرکاری گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ گاڑی کو ایک طرف کھڑا کر کے میں ان کا انتظار کرنے لگا، اتفاق دیکھیے، ٹہلے ٹہلے اعلیٰ حضرت بھی ادھر نکلے آئے، میری گاڑی کھڑی دیکھ کر پوچھا کہ یہ کس کی گاڑی ہے۔ جب انھیں بتایا گیا کہ یہ گاڑی داغ کی ہے تو پوچھا، کہاں ہیں؟ اعلیٰ حضرت کو جب وہ مقام بتایا گیا تھا جہاں میں کھڑا تھا تو وہ اس طرف بڑھے۔ گھوڑے پر سوار تھے۔ میں اعلیٰ حضرت کو اپنی طرف آتا دیکھ کر چھپا، مگر اعلیٰ حضرت بالکل ہی سامنے آگئے تو سلام کیا اور ایک اشرفی اور کچھ روپے، جو اُس وقت میری جیب میں تھے نذر گزارنے، اعلیٰ حضرت نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ فرمایا اور میں اُن کے ساتھ ہو لیا۔ ادھر ادھر کی دو چار باتوں کے بعد کلام سناتے کا حکم ہوا۔ میں نے اپنی یہ منزل سنائی:

دیکھے منصور اگر آج زمانا تیرا
ہو انا الحق کی جگہ لب پہ ترانا تیرا

داغ ہر ایک زبان پر ہو فسانا تیرا
وہ دن آتے ہیں، وہ آتا ہے زمانا تیرا
مرزا صاحب نے فرمایا کہ جب میں نے یہ دوسرا مطلع پڑھا تو اعلیٰ حضرت
نے زبان مبارک سے فرمایا کہ ”اس میں کیا شک ہے۔“ جس وقت ان کی
زبان سے میں نے یہ الفاظ سنے کچھ یقین سا ہو گیا کہ میں نوکر ہو گیا، اسی غزل
کا ایک شعر ہے،

مدعی دیکھ ہمیں چشمِ حقارت سے نہ دیکھ
کل ہمارا تھا، جو ہے آج زمانا تیرا
مرزا صاحب بولے کہ میں نے یہ شعر بہت زور دے کر پڑھا۔ اعلیٰ حضرت
بہت متاثر ہوئے اور دو دفعہ مجھ سے یہ شعر پڑھوایا، اس کے بعد میں
نے یہ شعر پڑھا:

تربکِ عادت سے مجھے نیند نہیں آنے کی
کہیں نیچا نہ ہواے گور سر ہانا تیرا
میرے اس شعر کے پڑھتے ہی تمام فضا فسر رہ ہو گئی، اعلیٰ حضرت بھی
متاثر تھے، لیکن شاہی محل میں اس طرح کی فسر دگی بھی مجھے گوارا نہ تھی،
فوراً دوسری یہ غزل شروع کر دی۔

کس وجہ سے لب پر مرے فریاد نہ آتی
وہ چوٹ نہیں کھاتی تھی، جو یاد نہ آتی

(ہزمِ داغ، ص ۷۵-۷۳)

یہ سب کچھ تو ہوا، لیکن داغ کی ملازمت کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔
داغ، نظام حیدر آباد سے بالکل مایوس ہو کر سخت پریشانی میں گرفتار ہیں کہ
چانک از فروری ۱۹۱۱ء کی شب نو بجے کچھ چوبدار آئے۔ انھوں نے ایک مہر شدہ لفافہ
داغ کو دیا۔ لفافہ کھولا تو معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت نے اصلاح کے لیے اپنی غزل بھیجی

ہے۔ چوبداروں نے زبانی یہ پیغام دیا کہ صبح آٹھ بجے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا ہے
 داغ نے غزل فوراً اصلاح کر کے واپس کر دی۔ صبح دربار میں حاضر ہو کر نذر پیش کی —
 چار سو پچاس روپے ماہانہ ابتدائے درود سے منظور ہوا۔ تین برس تک یہی وظیفہ ملا پھر
 اعلیٰ حضرت نے ایک ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ ابتدائے درود و حیدر آباد سے مقرر کر دیا۔
 جاگیر میں ایک گاؤں عطا ہوا اور مختلف اوقات میں بیش بہا تحفے بھی عطا ہوتے رہتے تھے۔
 نواب حیدر آباد ہی نے انھیں بلبل ہندوستان، جہاں استاد، دبیر الدولہ، ناظم یار جنگ،
 نواب قبیح الملک بہادر کے خطابات سے نوازا تھا۔

داغ کی بیوی کا انتقال حیدر آباد میں ہوا تھا۔ انھیں سید یوسف شریف کی درگاہ
 میں مدفون کیا گیا تھا۔

آخری عمر میں داغ نے اپنی سالی کی بیٹی (یعنی داغ کی خالہ عمدہ خانم کی نواسی)
 لاڈلی بیگم کو گود لے لیا تھا۔ لاڈلی بیگم کی شادی مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے
 صاحبزادے اور نواب مرزا سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی کے چھوٹے بھائی ممتاز الدین احمد خاں
 سے ہوئی تھی۔ ممتاز احمد خاں کا انتقال ہو گیا۔ سائل دہلوی نے دوسری شادی لاڈلی بیگم سے
 کر لی۔ داغ کے رشتے سے لاڈلی بیگم کو حیدر آباد سے تین سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ جب
 سائل اور لاڈلی بیگم کی شادی ہوئی تو داغ نے سائل کا بھی دو سو روپے ماہوار وظیفہ کرا دیا۔
 ۱۴ فروری ۱۹۰۷ء کو بلبل ہندوستان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ سید یوسف شریف
 کی درگاہ میں تدفین عمل میں آئی۔ اب کچھ باتیں داغ کی شاعرانہ شخصیت کے بارے میں۔
 داغ کا ایک شعر ہے:

دن گزارے عمر کے، ان ہنستے بولتے

جاذب بھی نیکی، تو میری جان ہنستے بولتے

یہ شعر داغ کی پوری شخصیت اور زندگی کی طرف ان کے رویے کی مکمل تفسیر ہے۔

داغ ایک جاگیر دار کے لڑکے تھے، والدہ کی وجہ سے ان کا بچپن عیش و عشرت
 میں گزرا۔ تیرہ سال کے ہوئے تو والدہ کے ساتھ لال قلعے میں چلے گئے۔ تقریباً

دس گیارہ سال قلعے میں رہے۔ اگر اس زمانے کے لال قلعے کے سماجی اور معاشرتی حالات کا تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ بابر، ہمایوں اور جہانگیر کا جاہ و جلال اور شان و شوکت زوال کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔ حکومت کی بالکل وہی کیفیت ہے جو ہمیشہ کے لیے آرام کی نیند سونے سے پہلے سنبھال لینے والے مریض کی ہوتی ہے۔ مغل حکومت لال قلعے کی دیواروں تک محدود ہے بلکہ یہاں بھی حکم صاحبان انگریز کا چلتا ہے۔ بادشاہ انگریزی سامراج کا پٹن خوار ہے اور یہ سامراج مغل حکومت کو ختم کرنے کے لیے مناسب موقع کا منتظر ہے۔ مغلوں کی وہ تلواریں جو ایک جنبش سے ہزاروں قسمتوں کا فیصلہ کرتی تھیں۔ اب زنگ آلود ہیں۔ شمشیر و سنان، تیغ و تبر اور تیر و سپر اب صرف شاعری کے موضوعات ہیں۔ بادشاہ، شہزادے، شہزادیاں، سلاطین اور ملازمین سب عیش و عشرت میں ڈوب کر زندگی کے تلخ حقائق سے فرار حاصل کر رہے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ وہ وقت قریب آ رہا ہے، جب یہ کچھ بھی باقی نہیں رہے گا، اس لیے ہر شخص ماضی کو فراموش کیے، مستقبل سے بے نیاز، صرف حال میں جی رہا ہے۔ اور عیش و نشاط کا آخری قطرہ بھی نچوڑنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ داغ کی زندگی کا بہترین وقت لال قلعے میں گزرا۔ یہیں ان کی جنسی خواہشیں جاگیں اور یہیں ان خواہشوں کی آسودگی کا سامان بھی فراہم ہوا۔ داغ کی مخصوص انداز کی شاعری نے ان کے ہم عمر لڑکے اور لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہو گا اور بہت سی لڑکیوں کے دل میں وہ ارمان بن کر رہے ہوں گے۔

اس زمانے میں طوائفوں سے تعلقات رکھنا عیب نہیں، بلکہ صاحب ثروت ہونے کی نشانی تھی۔ اس ماحول نے داغ کو رند شاہد باز بنا دیا۔ انھوں نے شراب کو تو کبھی ہاتھ نہیں لگایا لیکن حسن پرست زندگی کے آخری دنوں تک رہے۔ داغ کسی افلاطونی عشق کا شکار نہیں ہوئے۔ وہ تو خوبصورت چہروں کے دلدادہ تھے۔ اگر اچھی صورت پتھر میں بھی نظر آئے تو وہ اس کے عاشق۔ ان کا شعر ہے:

بت ہی پتھر کے کیوں نہ ہوں اے داغ
اچھی صورت کو دیکھتا ہوں میں

اب داغ کے دو شعر اور سنئے:

اک نہ اک ہم لگائے رکھتے ہیں
تم نہ ہوتے تو دوسرا ہوتا

کیا ملے گا کوئی حسیں نہ کہیں ؟

دل پہل جائے گا کہیں نہ کہیں

ان اشعار میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ شاعرانہ مضمون نہیں، بلکہ داغ کے جذبات کی حقیقی عکاسی ہے۔ اس سلسلے میں داغ کے خطوط کے دو تین اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ داغ کی شعر گوئی کا سب سے بڑا محرک خوبصورت چہرہ تھا۔ داغ، مٹی بانی حجاب کے عشق میں گرفتار ہیں، ان سے ملنے اور انہیں دیکھنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ اسی زمانے میں کلکتہ کے اپنے ایک دوست محمد وزیر کو جو خط لکھتے ہیں اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:

”میرے پاس کوئی تصویر حسینانِ کلکتہ کی نہیں ہے۔ حجاب کی بھی کوئی تصویر نہیں۔ اگر چند تصویریں آپ بھجوا دیں تو بڑی مہربانی ہو اور جو قیمت اس کی ہو وہ میں پہلے بھیج دوں، اس سے اطلاع بھیج دیجئے، مگر ہر تصویر کی پشت پر نام و نشان و سکونت ضرور لکھ دیا کیجئے۔ میں نے شعر کہنا چھوڑ دیا ہے۔ مرضِ فرصت دیتا ہے نہ کارِ سرکار — ان دنوں علیل ہوں۔ دعا کرو..... یہ تصویریں اس واسطے منگائی جاتی ہیں کہ شاید ان کے دیکھنے سے ہیجانِ طبیعت ہو تو اس نشے میں کچھ بک سکوں۔“ (۶ جولائی ۱۸۸۶ء)

اس خط میں داغ نے جو کچھ کہا ہے، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ داغ جنسی لذتوں سے گزر چکے تھے، لیکن حسن پرستی ان کی گھٹی میں ملی ہوئی تھی اور خوبصورت چہروں سے انہیں شعر گوئی کی تحریک ہوتی تھی۔

ملکہ جان کلکتہ کی طوائف ہیں۔ وہ داغ اور حجاب کے معاملات سے واقف ہیں۔ انہوں نے داغ کو خط لکھا۔ داغ اس کے خط کا جواب دیتے ہوئے، کس خوبصورتی

دآغ دہوی

(حیات اور کارنامے)

3

کل ہند دآغ سیمینار میں پڑھے گئے
مقالات کا مجموعہ

مرتبہ
ڈاکٹر کامل قریشی



اردو اکادمی، دہلی

ہے، لیکن فحاشی اور عریانی سے پاک — وصل کی شاعری نے داغ کو جو نشاطیہ لب و لہجہ دیا ہے وہ کسی اور اردو شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔

آخر میں داغ کی شخصیت کے بارے میں ایک بات اور عرض کر دوں۔ داغ نے جس معاشرے میں زندگی گزاری، اس کی سب سے بڑی خصوصیت منافقت تھی۔ ظاہر و باطن میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اندھیرے اور اُجالے میں کردار مختلف ہوتے تھے۔ ہر سماج میں منافقت ہمیشہ ہوتی ہے لیکن نردالِ آمادہ معاشرے کی سب سے بڑی خصوصیت منافقت ہوتی ہے، ہمارے بیشتر شاعروں کی دو شخصیتیں ہیں، ایک تو وہ مثالی شخصیت، جو اُن کے فن میں نظر آتی ہے اور دوسری ان کی اصل اور حقیقی شخصیت — غالب اور اقبال جیسے عظیم شاعروں کے کردار و گفتار میں بھی تضاد نظر آتا ہے۔ داغ کے یاں ہر گز یہ معاملہ نہیں۔ اُن کا ظاہر و باطن ایک ہے، اُن کے قول و فعل میں کوئی فرق نہیں۔ وہ علی زندگی میں جو کچھ کرتے ہیں، اس پر شرمندہ نہیں ہوتے اور جو کچھ سوچتے ہیں، اس کا شاعری میں بر ملا اظہار کرتے ہیں۔ نشاطیہ لب و لہجہ، غیر منافقانہ رویہ اور دہلی کی زبان پر پوری قدرت۔ داغ کی مقبولیت کا راز یہی۔

کتابیات

- ۱- زبان داغ، مجموعہ مکاتیب نواب مرزا خاں داغ دہلوی، مرتبہ سید رفیق مارہروی لکھنؤ، ۱۹۵۵ء۔
- ۲- گلہائے داغ، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، ڈھاکہ، ۱۹۵۴ء۔
- ۳- گل کدہ داغ، مرتبہ نواب عزیز یار جنگ، حیدر آباد دکن، ۱۳۶۲ھ
- ۴- انتخاب کلام داغ، ڈاکٹر محمد عقیل، الہ آباد، ۱۹۶۰ء
- ۵- بزم داغ، مرتبہ سید رفیق مارہروی، لکھنؤ، ۱۹۵۶ء
- ۶- داغ دہلوی، نور اللہ محمدی، حیدر آباد دکن، ۱۳۵۵ھ
- ۷- بہار داغ، سید نذیر نیازی، لاہور، ۱۹۴۰ء
- ۸- آفتاب داغ، حکیم سید ظہیر علی، حیدر آباد دکن، ۱۳۰۲ھ
- ۹- مہتاب داغ، مرتبہ کلب علی خاں فائق، لاہور،
- ۱۰- نگار، لکھنؤ، اپریل ۱۹۵۳ء
- ۱۱- نگار۔ (داغ نمبر)، لکھنؤ، جنوری، فروری ۱۹۵۳ء۔

پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی

جاتی ہوئی بہار کا آخری نغمہ سن

(داغ اور لال قلعہ)

۱۸۵۷ء سے پہلے کی دہلی کی رونق اور لال قلعے کی شان و شوکت کی کہانیاں اس دنیا کی نہیں لگتیں۔ اور سچ پوچھیے تو وہ تھی بھی ایک اور ہی دنیا۔ زندگی کے سارے جھمیلوں سے آزاد، جیسے یہاں کے سب کام نبٹ چکے ہوں۔ بہاروں کے خیر مقدم، چاندنی راتوں کے جشن، ساون کے میلے نغمہ درقص، پھل پھڑیاں، ہتھابیاں، مشاعرے، رت بجے ایک خواب کا سا عالم تھا۔ اسی دہلی میں ابراہیم نے آنکھ کھولی۔ وہ نواب شمس الدین خاں اور چھوٹی بیگم کے بیٹے تھے۔ شمس الدین خاں کو جب پھانسی ہوئی تو ابراہیم کی عمر ساڑھے چار سال کی تھی۔ چھوٹی بیگم آغا تراب علی کے ہاں آگئیں۔ یہاں اُن کے ایک اور صاحبزادے ہوئے جو مرزا شاغل کہلائے ہوئے ہوتے چھوٹی بیگم کے حسن کے چرچے قلعہ معلیٰ تک پہنچے۔ بقول مولانا محمد حسین آزادؒ: ”وہ ایک حسین، صاحب جمال اپنے ہنر کی باکمال تھیں عمر کی دو پہر ڈھل چکی تھی۔ کتنے ہی امیروں کو ماز کر مضمر کر چکی تھیں۔ اس پر بھی نرگس کی کلیاں چنتی تھیں۔“ لہ چنانچہ

لہ محمد حسین آزادؒ: دیباچہ دیوان ذوق

بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد مرزا فخر دان پر ہزار جان سے فدا ہو گئے اور وہ قلعے میں پہنچ گئیں ان کے ساتھ ان کے تیرہ چودہ سال کے بیٹے تھے جو یہاں پہنچ کر نواب ابراہیم سے نواب مرزا خاں ہو گئے۔ یہاں اب ان کے لیے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ مرزا فخر دان نے ان کی تعلیم و تربیت کے لیے وہ سارے انتظامات کیے جو شہزادوں کے لیے ہوا کرتے تھے۔ مولوی سید احمد حسین نے درسی کتابیں پڑھائیں۔ محمد امیر پنجہ کش نے خطاطی سکھائی۔ مرزا عبداللہ بیگ نے بانک۔ سخن خاں اور بند و خاں نے شہسواری اور خود مرزا فخر دان نے بند و ق بازی اور تیر اندازی سکھائی۔ حسن پرستی تو بے سکھائے ہی آجاتی ہے۔ اور پھر ایسے ماحول میں جہاں تسکین جسم و جان کے مواقع بھی بہم ہوں۔ طبیعت کی جولانیاں کیا کیا نہ رنگ لائی ہوں گی۔ چنانچہ داغ شعرو شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ یہ اس زمانے کا فن شریف تھا، جو کسی نہ کسی استاد کے طفیل سب کو آجاتا تھا۔ اور اچھی بری شاعری سب ہی پڑھے لکھے کر لیا کرتے تھے قلعے سے لے کر شہر کے گلی کو چون تک شعرو شاعری کا چر چار تنہا، مشاعرے رات رات بھر جاری رہتے جہاں اساتذائے فن اپنے اپنے شاگردوں کے ساتھ آتے۔ زبان کے نکات، محاورے کی صحت اور عروض کی باریکیوں پر بحثیں ہوتیں، بلکہ معرکے سر کیے جاتے۔ بادشاہ کا دربار، رئیسوں کے دیوان خانے اور طوائفوں کے ٹھکانوں پر برپا ہونے والی محفلیں، اب یہی بس دل و دماغ کی تربیت کا ہیں رہ گئی تھیں جہاں من چلے نو جوان ہوش سنبھالتے ہی آجاتے اور اپنی اپنی اہلیت کے مطابق کسب فیض کرتے۔ داغ کو یہ فضا کیوں نہ رس آتی۔ فو خیز تھے اور حیثیت بھی رکھتے تھے شکل و صورت تو خیر جیسی تھی اللہ کی دی ہوئی تھی۔ یہیں وہ ادروں سے کمزور پڑتے تھے۔ چنانچہ حکمت عملی کا تقاضا بھی یہی ہو گا کہ فن شعر میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کریں میر حبیب پہلے ہی کہہ گئے ہیں۔

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے وہی اب فن ہمارا

وہ ذہین تھے طبیعت میں اُتج تھی۔ اس لیے شاعری ان کو راس آئی۔ مرزا فخر نے ان کی صلاحیتوں کو دیکھا تو انھیں اُستاد ذوق کے سپرد کر دیا۔ اب کیا تھا۔ داغ کے مذاق کو اور جلاہوئی دلی کی صاف ستھری، ڈھلی ڈھلائی زبان میں موقع کے ہلکے پھلکے شعر دلوں کو لوٹنے لگے۔ قلعے کے ایک مشاعرے میں غالب کی زمین میں غزلیں پڑھی گئیں۔ داغ نے بھی ایک غزل سنائی۔ کہا جاتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے ان کے ایک شعر پر جی بھر کے داد دی۔

شعر تھا؛ ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دکھی
کسی کا اس طرح یا رب نہ دنیا میں بھرم نکلے

ان کی شاعری کی فضا اس وقت کی دلی اور لال قلعے کے ماحول سے ایسی ہم آہنگ تھی کہ ابلاغ کا مسئلہ ہی نہ پیدا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مقبولیت ان کے قدم چومنے لگی۔ زبان پر انھیں اتنی قدرت تھی کہ بات کہنے کا انداز مانوس ہونے کے باوجود سب سے الگ تھا۔ چنانچہ غالب، آزاد، شفیق اور صہبائی جیسے اساتذہ نے داد دی۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخر کا انتقال ہوا تو چھوٹی بیگم کے ساتھ داغ اور ان کے دو علاقائی بھائی مرزا شاعری اور مرزا فخر کے بیٹے غور شید عالم لال قلعے سے نکلے۔ اسی زمانے میں چھوٹی بیگم کا تعلق بلاک نام کے ایک انگریز سے ہو گیا۔ داغ کی عراب اکیس بائیس برس کی تھی۔ رام پور کے نواب یوسف علی خاں سے اپنی خالہ عمدہ بیگم کی بدولت وہ بچپن ہی سے متعارف تھے۔ اسی نسبت کی بنا پر وہ رام پور پہنچے۔ یہاں شاعروں میں امیر جلال اسیر، نسیم، میر جیسے اساتذائے سخن اور دوسرے فنون کے ماہر بھی جمع ہوتے جا رہے تھے۔ بقول مولانا محمد علی ”اس زمانے میں دہلی اور لکھنؤ کے آسمانوں کے ٹوٹے ہوئے تارے سب رام پور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔“ داغ ان سب پر چھا گئے۔ وہ نواب یوسف علی خاں کے مقرب خاص ہوئے۔ یہاں ہر سال مارچ کے آخر اور کبھی کبھی اپریل کے آغاز تک بارگاہِ نظر کا میلہ ہوتا جس میں سارے ملک کے ارباب نشاط جمع ہوتے۔ اس عہد کی سب سے حسین اور پُر فن طوائفوں کو ہندوستان کے کونے کونے سے بلایا جاتا۔ رات رات بھر جشن رہتے اور عوام و خواص اپنی اپنی توفیق و استطاعت کے مطابق دادِ عیش دیتے۔ یہیں داغ نے پہلی بار منی بانی حجاب کو دیکھا اور تمام عمران کے گن گاتے رہے۔ رام پور کے یہ مزے نواب علی خاں

کی زندگی تک باقی رہے پھر خواب و خیال ہو گئے۔ رام پور کی بزم عشرت درہم برہم ہوئی تو
 داغ کچھ عرصے بعد دکن کو سدھارے۔ اب وہ شہرت کی اُس منزلی پر پہنچ چکے تھے کہ اُن کو
 دکن پہنچنا خود اہل دکن کے لیے اعزاز تھا۔ نظام کا خزانہ اہل علم و ہنر کے لیے پہلے ہی کھلا
 رہتا تھا۔ داغ پہنچے تو اُن کو کبھی نظام نے دولت و اعزاز سے نوازا۔ پھر بڑی تنخواہ پر ملازم
 رکھا، اپنا استاد بنایا اور فصیح الملک کا خطاب عطا کیا۔ نظام کے مصاحبین خاص کے زمرے
 میں آنے کی بنا پر حیدر آباد میں اُن کو غیر معمولی عزت و حیثیت حاصل ہوئی اور اسی کی
 نسبت سے ان کی خواہش کے مطابق عیش و عشرت کے مواقع بھی ملے۔ مذاحوں اور شاگردوں
 کے گردہ تھے۔ احباب کا مجمع تھا، حسینوں کے پرے کے پرے تھے اور اُن کی طبع رواں کی جولانیوں
 کے لیے کھلا ہوا میدان تھا۔ تمام عمر بے فکر سی سے کٹی۔ لال قلعہ بہت پہلے اجڑ چکا تھا۔ مگر اس
 کی دیوار کا سایہ داغ کے سر پر جیتے جی قائم رہا۔ دہلی، دہلی کی زبان، وہاں کی خوشگوار صحبتیں
 اور اس سے وابستہ یادیں ان کے دل و دماغ میں بسی ہوئی تھیں۔ زمانے نے ان کو موقع بھی
 ایسے دیے کہ وہ ہر لمحہ ان یادوں کو تازہ کرتے رہے۔ لال قلعہ ہند ایرانی تہذیب کے عروج
 کی علامت تھا۔ مدتوں سے سارے ملک کے امیروں اور رئیسوں کے ہاں رکھ رکھاؤ کا معیار
 وہی ہوتا جو لال قلعے میں بنتا تھا۔ دربار کے طور طریقے، مراتب و مدارج، لباس، وضع قطع،
 آداب محفل انداز گفتگو، معیار شاعری غرض کہ زندگی کے ہر شعبے پر اُسی تہذیب کا پر تو تھا۔
 مغل دربار ختم ہوا تو اس کے عناصر ملک کے مختلف علاقوں کی ریاستوں میں بکھر گئے۔ ایسٹ
 انڈیا کمپنی نے مغل سلطنت کی مرکزیت کو توڑنے کے لیے علاقائی جاگیرداروں کی پشت پناہی
 کی تھی اور دھیرے دھیرے مغل سلطنت کے کاروبار کو بھی بادشاہ کی پیشن کے عوض اپنے ہاتھ میں
 لے لیا تھا۔ اور کچھ ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ ملک گیری کی خواہش تو دونوں سے نکل جائے مگر
 اُس کی آسائش باقی رہے۔ چنانچہ اودھ ہو یا دکن یا رام پور سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں تھیں۔
 ۱۸۵۷ء کے بعد دیسی ریاستیں، برطانوی حکومت کی سرپرستی میں چند خاندانوں اور ان کے
 حاشیہ برداروں کی عشرت گاہیں بن گئیں۔ ملک کے طول و عرض میں اُٹھنے والی سیاسی تحریکوں
 کی ہوا بھی اُن لوگوں تک نہ پہنچی تھی۔ اور تو سب کچھ جانے دیجئے داغ کی شاعری میں خود اُن
 کی زندگی کے المیوں کے نشانات بہت کم ملتے ہیں۔ ساڑھے چار سال کی عمر میں باپ کو بھانسی

پاتے دیکھا۔ پھر جوان ہونے تک زندہ رہنے کی خاطر ماں کے ساتھ ایک گھر سے اٹھ کر دوسرے گھر جانے پر مجبور ہوتے رہے۔ ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء میں کچھ عرصے تک ماں کے ساتھ دو چھوٹے بھائیوں کی کفالت کا خیال پھر رام پور سے اُڑنے کے بعد بڑھاپے میں معاش کی فکر اور دکن کی طرف کوچ، یہ سب باتیں ایک حسّاس شخصیت کے لیے کیا کم تھیں۔ مگر داغ ہر زہر کو پی گئے۔ غموں کو بھول گئے۔ نشاط و مسرت سے دامن بھرتے رہے اور یہ دامن بھی دراز ہوتا رہا۔ اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ جو مزاج، جو تہذیبی اثاثہ وہ لال قلعے سے لے کر چلے تھے تمام عمر نہ صرف ان کے ساتھ رہا بلکہ اس کی قدر و قیمت بھی بڑھتی چلی گئی۔ داغ کی شاعری کا محور بزم آریاں ہیں جو انھوں نے لال قلعے میں دیکھی تھیں یہ بزم کہیں تو کسی امیر کا دربار ہے جہاں اہل ہنر کا مجمع ہے، کہیں شاگردوں، دوستوں اور معتقدوں کا جگمگا ہے۔ جہاں جانِ محفل خود داغ ہیں۔ یہی بزم کہیں محبوب کا شہستان ہے۔ نغمہ و شعر، جام و مینا، انداز و ادا بھی ہے، رقیبوں سے چھیڑ چھاڑ بھی۔ دھل کا نکلنے بھی اور ہجر کا دھڑکا بھی ہے۔ بزم آرائی کی جان اندازِ گفتگو ہے۔ پیار کی باتوں سے لے کر تلخ و ترش سنانے تک بات کہنے کا سلیقہ چاہیے جو موثر بھی ہو اور گوارا بھی۔ اختلاف ہو تو وہ بھی ایک ادا سے، شکوے شکایتیں ہوں تو ایسے کہ اثر کر جائیں۔ اشاروں کنایوں میں پوری پوری کہانیاں کہہ جانا۔ لہجے کے اتار چڑھاؤ سے جانے بوجھے لفظوں میں نئے نئے انوکھے معانی پیدا کر دینا۔ استعاروں میں رازوں کو کبھی فاش کرنا، کبھی چھپا جانا، روٹھے ہوؤں کو منانا، منہ بسورنے والوں کو ہنسانا، غرض کہ ہر بات کو کچھ ایسے بنانا کہ چار آدمیوں کے سامنے کہی جاسکے۔ مثلاً

ہاں ہاں! تڑپ تڑپ کے گزاری تھیں نے رات

تم نے ہی انتظار کیا ہم نے کیا کیا

یا

مرتا مگر اس حال سے فرقت میں نہ مرتا آتی مگر اس طرح تری یاد نہ آتی

یہ اندازِ گفتگو محفلوں میں اور ایسی ہی محفلوں میں پتہپ سکتا ہے جہاں لوگوں کو پوری فرصت فراغت ہو اور جہاں زندگی کا مرکز محض محفل ہو۔ آج کے زمانے میں اچھا

مشکل سے ہی ملتا ہے۔ مگر داغ کا زمانہ وہ تھا جب تربیت کا لازمی جزو آداب گفتگو ہوا کرتے اور یہ تہذیب داغ کی شاعری میں ہی نہیں مزار سوا کے نادل امراد جان ادایں بھی ملے گی۔ اس ریشمی تہذیب کی سطح پر جو خوبصورتی جو نزاکت اور چمک دمک تھی اس کی نمائندگی داغ نے اس کمال کے ساتھ کی کہ حاتی اور اقبال جیسے لوگ بھی اُن کے آگے سر تسلیم خم کرتے تھے گو کہ داغ کی شاعری مجموعی طور پر ان حضرات کے ادبی نقطہ نظر سے اس قدر متضاد تھی کہ اگر وہ داغ کی شاعری کی مثال دیتے بھی تو محض عبرت کے لیے دیتے۔ بہر حال اس ماحول کا ایک خوشگوار اثر یہ ہوا کہ دلی کی ٹھٹھ زبان اپنے بے پایاں حسن کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ عہدِ اسلام میں جب دلی اُجڑ رہی تھی تو بس ایک زبان بچی تھی جسے جاتے جاتے چند دلی والوں نے سمیٹ لیا اور سینت کر رکھا۔ اس کام کی سب سے زیادہ صلاحیت داغ میں تھی۔ اُنھوں نے اپنے شاگردوں کے دریغ یہ خزانہ سارے ہندوستان میں لٹایا۔ زبان کا یہی ٹھٹھ داغ کی شاعری کا جو ہر قرار پایا۔

داغ کے سوانح نگاروں کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ داغ بڑے زود گو تھے۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے شعر کہہ دیتے تھے۔ مصرع طرح بہ بلا تکلف غزلوں پر غزلیں کہتے چلے جاتے۔ فصیح اللغات کی ترتیب کے زمانے میں اگر کسی لفظ کی سند کے لیے ان کا کوئی شعر نہ ملتا تو وہ موقوفِ لغت کی فرمائش پر شعر کہہ کہہ کر دیتے رہتے۔ ظاہر ہے کہ ایسی شاعری میں گہرائی کیا ہوگی۔ معافی کی وہ کار فرمائیاں کہاں سے آئیں کہ ہر بار شعر پڑھنے سے کوئی نئی جہت نظروں میں آجائے۔ نئی تہہ کھلتی چلی جائے۔ چنانچہ داغ کے کلام کا بیشتر حصہ ایسا ہے جہاں فکر و خیال ناپید ہیں اور جذبات ادھر سے اُڑھے ہوئے۔ یہاں عشق کی نیرنگیاں نہیں بلکہ عشق بازی کی یکسانیت ہے، جو زبان کے سہارے چلتی ہے۔ زبان کا لطف اپنے کمرشموں کی بدولت ان کی شاعری کے اکہرے پن کو گوارا بلکہ خوشگوار بنا دیتا ہے عشق بازی ان کے مزاج کا جزوِ اول تو تھی ہی یہ ضرورت شعری بھی تھی! مزے مزے کی چوٹیں، پر تکلف باتیں، گٹھے کرنا، روٹھنا، مان جانا، دوستوں اور معشوقوں سے نامہ و پیام زندگی کی اصلی مصروفیت اور شاعری کا انسپریشن تھے۔ یہی وجہ ہے کہ داغ کے اشعار آغازِ شباب میں کام آتے ہیں جب نازک موقعوں پر زبان ہکلائے لگتی ہے، نئی نئی انگلیں اُٹھا رہا ہستی ہیں تو داغ کے اشعار

زبان بن جاتے ہیں۔ یا پھر شاید وقت پیری میں کام آتے ہوں گے جب محض باتوں پر ہی گزارا ہوتا ہو۔

مگر داغ کی شخصیت میں کہیں ایک اور شاعر چھپا ہوا تھا۔ لیکن ان کی دربار داری مقبولیت اور استادئی فن نے اُسے ایسا مارا کہ وہ ان کے کلام میں جہاں بھی ملتا ہے سہما سہما، دبا دبا رہتا ہے۔ داغ نے سکون سے زندگی گزارنے کی خاطر اپنا ایک ایج بنایا جو دنیا کو اچھا لگا تو خود داغ بھی اس پر رکھ گئے۔ اب اس ایج کو توڑنا کون؟ ورنہ داغ کے کلام میں ایسے بھی آثار ملتے ہیں کہ اگر انہوں نے تخلیق فن کے معاملے میں زمانے سے مفاہمت نہ کی ہوتی تو شاید ہمارے بعض بڑے شاعروں سے انکھ ملا سکتے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیے

بھٹکتے پھرتے دعا کی طرح ہم اے زاہد
بھلا ہوا کہ درے کدہ نہ بند ہوا

اور

عرش و کرسی پر کیا خدا ملتا
آگے بڑھتے تو کچھ پتا ملتا

داغ دراصل قلعہ معلیٰ کے نہیں قلعے سے باہر کے تھے جو وہاں اپنی ماں کے ساتھ گئے تھے۔ انہوں نے قلعے سے باہر کی دنیا بھی خوب دیکھی تھی۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بھی داغ کا واسطہ پڑا تھا۔ اگر ان کی نال لال قلعے میں گڑی ہوتی تو وہاں سے نکلنے کے بعد وہ ہکا بکارہ گئے ہوتے اور شاید وہ دنیا داری انہیں نہ آئی ہوتی جس کے سہارے وہ تمام عمر آسودہ رہے بقول خود ان کے

فسردہ دل کبھی خلوت نہ انجمن میں رہے

بہار ہو کے رہے ہم تو جس چمن میں رہے

مگر لال قلعے کا زمانہ ان کی زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ یہیں انہوں نے لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھا اور اعتبار حاصل کیا۔ جب وہ لال قلعے سے نکلے ہوں گے تو یقیناً ان کے ذہن میں ان دو دنیاؤں کے تقابل کا شعور سی یا غیر شعور سی عمل ہوا ہوگا اور انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ لال قلعے

سلسلہء مطبوعات اردو اکادمی، دہلی ۸

DAAGH DEHLAVI
(HAYAT AUR KARNAME)

Collection of Papers on All India Daagh Seminar

Compiled by : Dr. Kamil Quraishi

Print : 1997 Rs. : 50.00

۱۹۸۶ء

اشاعت اول :

۱۹۹۷ء

اشاعت دوم :

پچاس روپے (= ۵۰)

قیمت :

شمار آفسیٹ پریس، دہلی

طباعت :

ناشر و تقسیم کار

اردو اکادمی، دہلی۔ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ISBN: 81-7121-007-4

میں آنھیں جو کچھ ملاوہ باہر کی دنیا سے کہیں زیادہ حسین اور بیش قیمت ہے۔ اُن کے لیے دنیا سے نباہ کرنا ان لوگوں کے مقابلے میں نسبتاً آسان رہا ہوگا جنھوں نے اپنی زندگی میں صرف قلعہ دیکھا تھا۔ قلعے کے باہر تو اُن کی رعایا تھی۔ آنھیں کسی کے آگے ہاتھ پھیلا نا، رحم و کرم کی اُمید کرنا آتا ہی نہ ہوگا۔ مگر داغ ان میں سے نہیں تھے۔ وہ قلعے سے نکل کر بھی کامیاب ہوئے۔ وہ جس دربار میں بھی گئے قلعہ معنی کی یادگار بن کر گئے۔ اسی لیے اوروں سے بلند رہے ساتھ ہی ساتھ درباروں میں سرفرازی کے گر بھی انھوں نے خوب آزمائے۔ افتخار عالم مارہروی روزنامچے میں لکھتے ہیں کہ نظام نے ایک بار داغ سے سوال کیا کہ ان کے شاگردوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ داغ نے نظام کو جواب لکھ کر بھیج دیا۔ جب اُن سے پوچھا گیا کہ انھوں نے کیا جواب دیا تو بولے ”میں نے زمانے کو زمانے کی طرح دیکھا ہے۔ لال قلعے میں پرورش ہوئی۔ بہت دنوں تک نواب کلب علی صاحب کی دربار داری رام پور میں کی اور اب اتنے دنوں سے دکن میں ہوں۔ میں نے حضور نظام کو لکھ دیا کہ آپ سے بہتر میرا کوئی شاگرد نہیں۔ آخر وہ بھی میرے شاگرد ہیں!“

اردو شاعری کی پوری تاریخ میں داغ اکیلے PLAY BOY ہوئے جن کی خوش دلی اور خوش باشی نے ہماری شاعری کو ایک نئے موڑ سے آشنا کیا۔ وہ جاتی ہوئی بہار کے آخری زمزمہ سنج تھے جو اردو کے سرچشموں تک پہنچے اور اس کی قوتِ نمو کو آشکار کیا اور شاعرانہ اظہار کی زبان کو زندہ تر کر گئے۔

داغ حیدر آباد میں

۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء میں نواب کلب علی خاں والی رامپور کی رحلت ان کے دربار سے وابستہ علماء، شعراء اور اہل کمال کے لیے ایک ایسا سانحہ عظیم تھی جس نے رامپور کی علمی و ادبی محفلوں کو ہمیشہ کے لیے درہم برہم کر دیا اور ان کے سایہ عاطفت میں داغ حیدر آبادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے سخن گوئے سہارا ہو گئے ان ہی متوسلین میں داغ دہلوی بھی تھے۔ کلب علی خاں کے انتقال کے بعد کونسل کا تقرر عمل میں آیا اور ارباب اقتدار سے داغ کی ان بن ہو گئی تو رامپور کی ملازمت سے

الف (الف) :- محمد علی خاں اثر رامپوری۔ (مضمون) رامپور اور داغ۔ رسالہ نگار۔ داغ نمبر ۵۳، ۱۹ صفحہ ۴۸

ب :- محمد علی زیدی۔ مطالعہ داغ۔ صفحہ ۹۴ (ج) سید رفیق مارہروی نے ”زبان داغ“ میں کلب علی خاں

کا سہ انتقال ۱۸۸۷ء تحریر کیا ہے۔ صفحہ ۲۲

۳ نور اللہ محمد نوری نے اپنی کتاب ”داغ دہلوی“ میں کلب علی خاں کے انتقال کے بعد کونسل کے قیام کا سنہ ۱۸۸۷ء تحریر کیا صفحہ ۸، جس کی محمد علی خاں اثر اور ملکین کاظمی کے بیانات سے تردید ہوتی ہے۔

دستبردار ہو کر ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء میں دلی چلے آئے۔ اپنے ایک قطعے میں داغ رامپور کی سکونت ترک کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں۔

رہے کیا مصطفیٰ آباد میں داغ
مزے سارے تھے وہ خلد آشیان تک

رامپور سے مراجعت کے بعد اپنے وطن میں داغ کا زیادہ عرصہ قیام نہیں رہا اور انھوں نے امرتسر، کشن کوٹ، اجیر، اگرہ، علی گڑھ، ممہرا، اور جے پور وغیرہ کا سفر اختیار کیا۔ مختلف مقامات کی سیاحت کر کے داغ دلی واپس ہوئے۔ ذرائع آمدنی مسدود ہو چکے تھے۔ رامپور میں مستقل ماہانہ مشاہیرہ کے علاوہ نواب کی داد و دہش سے بھی مستفید ہوتے تھے۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ ”دلی میں رہے کھائیں گے کیا؟“

اس زمانے میں ریاست حیدرآباد میں آصف سادس میر محبوب علی خاں سربراہانے سلطنت تھے اور ان کی مربیانہ قدر دانی، علم پروری اور ادب نوازی کے شمالی سند میں بڑے چرچے تھے۔ اہل حیدرآباد داغ کی شاعری کے مداح تھے۔ دال منڈی کے نامک میں حیدرآبادی شیدائیان شعر و سخن داغ کی وہ غزلیں سن چکے تھے جن میں زبان کا پختار بھی موجود تھا اور سلاست و صفائی کے ساتھ ساتھ وہ رنگینی و شگفتگی اور وہ سحر آفرینی بھی تھی جو سامعین کے دلوں کو متحرک کر لیتی۔ اقبال کے الفاظ میں داغ ایک ایسا نادک فلک تھا جو دل پر تیر چلاتا تھا اور اہل حیدرآباد کے دل پر یہ تیر چل چکے تھے ”گلزار داغ“ کے ساتھ حیدرآباد میں داغ کی شہرت پہنچ گئی تھی اور وہ ریاست کے مخصوص ادبی حلقوں کے علاوہ عوام میں بھی خاصہ مقبول اور ہر دل عزیز بن چکے تھے۔ حیدرآباد میں بعض شعرا نے داغ سے شرف تلمذ بھی حاصل کیا تھا اور ان سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ نثار علی شہرت ”آئینہ داغ“ میں لکھتے ہیں کہ حیدرآبادی عوام کلام داغ کے دلدادہ تھے،

۱۷ نور اللہ محمد نوری۔ داغ دہلوی۔ صفحہ ۸۔

۱۸ نور اللہ محمد نوری۔ داغ دہلوی۔ صفحہ ۱۰۔

کے دلدادہ شخص تھے اور داغ کے پرستاروں میں سے تھے۔ انھوں نے بھی داغ کو حیدر آباد آنے کی ترغیب دی تھی۔ یہ بقول علامہ صدیقی گوہر پہلی عرضی راجہ گردھاری پرشاد بنسی راج کی معرفت پیش گاہ اقدس میں بھیجی گئی تھی۔ یہ راجہ گردھاری پرشاد باقی اور حاجی محمد ابراہیم خان اماں کو شاہ دکن کا تقرب حاصل تھا اور انھوں نے نظام سے داغ کے کلام کی تعریف کر کے غائبانہ طور پر انھیں شمالی ہند کے اس خوش گو شاعر سے متعارف بھی کروادیا تھا۔ راجہ گردھاری پرشاد نے داغ کا وہ قصیدہ جو آصف سادس کی مدح میں تھا۔ ان کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ بنسی راج کی معرفت داغ نے بنو عرضی نظام حیدر آباد کے حضور میں بھیجی تھی اس پر انھیں باریابی کا حکم ہوا تھا اور داغ نے حاضر دربار ہو کر یہ قصیدہ میر محبوب علی خان کی نذر کیا تھا۔

میں ہوا یاد یہ پیمائیاں طرت ملک دکن
سرمہ چشم غزالاں ہوئی گردِ دامن
نازمینوں کی کمر بید کی شاخ لہزاں
موجہ ریگ رواں زلف پریشان کی شکن

داغ حیدر آباد کے مشاعروں میں شریک ہو کر طرہی غزلیں سناتے رہے تھے تمکین کاظمی لکھتے ہیں :-

”نواب محمد علی خاں مرحوم فرماتے تھے کہ انھوں نے داغ کو پہلی دفعہ اسی مشاعرے میں جس کی بناء چند دلال شاداں نے ڈالی تھی دیکھا اور سنا تھا۔ داغ نے جو غزل سنائی اس کا مطلع اور مقطع تھا

لے چلا جان میری ردھ کے جانا تیرا
ایسے آنے سے تو بہتر تھا نہ آنا تیرا

لے تمکین کاظمی۔ داغ۔ صفحہ ۹۹۔

لے تنزک محبوبہ۔ جلد دوم۔ دفتر ہفتم۔ ردیف د۔ صفحہ ۳۳۔

لے محمد علی زیدی۔ مطالعہ داغ۔ صفحہ ۹۶۔

داغ ہر ایک زبان پر ہو فسانہ تیرا
 وہ دن آتے ہیں وہ آتا ہے زمانہ تیرا
 ایسا معلوم ہوتا ہے کہ داغ کو حیدر آباد کی سکونت پسند آتی تھی۔ اسی غزل میں داغ کہتے ہیں:

آرزو ہی نہ رہی صبح وطن کی مجھ کو
 شام غربت ہے عجب وقت سہانا تیرا

داغ کے اس اولین قیام حیدر آباد کی کہی ہوئی یہ غزل بہت پسند کی گئی تھی۔ اس غزل کے اشعار سے داغ کی اس تمنا کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ ریاست حیدر آباد میں مستقل طور پر رہائش اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور ”دن رات“، ”جشن شہانہ“ سے محظوظ ہونے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ یہ آرزو اس طرح شعر کے قالب میں ڈھل گئی ہے:

میرزا داغ ہو یا شاہ دکن موردِ لطف
 اور دن رات رہے جشن شہانہ تیرا

احسن مارہروی رقمطراز ہیں کہ داغ نے یہ غزل اس تقرب سے بہت پہلے لکھی تھی اور دوبارہ کی پہلی حاضری کے موقع پر یہ مطلع جب میر محبوب علی خاں کو سنایا تھا تو انہوں نے دوبارہ ”بیشک بیشک“ فرمایا تھا۔ یہ شعر حیدر آباد میں داغ کے مستقبل کی پیش گوئی ثابت ہوا۔ حیدر آباد کے اس مختصر سے قیام میں بھی داغ کے کئی مداح اور قدر دان پیدا ہو گئے تھے۔ ریاست کے بعض خوش فکر سخی سنجوں نے داغ کی شاگردی بھی اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ بقول نور اللہ محمد نوری، میر محمد علی خان رنج اور میر مہدی حسین آلم داغ کے اسی زمانے کے تلامذہ ہیں۔ اس قلیل عرصے میں داغ نے حیدر آباد کے امرار اور اعلیٰ عہدیداروں سے مراسم پیدا کر لیے تھے اور متعدد مشاعروں میں شرکت کر کے اہل حیدر آباد کے دلوں پر اپنے شاعرانہ کمال اور استاد کی کاسک بٹھا دیا تھا۔ اُس زمانے میں داغ حیدر آباد کے محلہ افضل گنج

۱۔ تمکین کاظمی۔ داغ۔ صفحہ ۱۱۲۔

۲۔ احسن مارہروی۔ منتخب داغ۔ حصہ اول۔ مقدمہ۔ صفحہ ۴۔

میں بھی قیام پذیر رہے تھے چنانچہ اپنے ایک شعر میں وہ کہتے ہیں :-
اڑاتے ہیں مزے دنیا کے ہم اے داغ گھر بیٹھے
دکن میں اب تو افضل گنج اپنی عیش منزل ہے ملے

شاعر علی شہرت ”آئینہ داغ“ میں لکھتے ہیں کہ جب داغ حیدر آباد آئے تو شہر میں دھوم مچ گئی۔ شائقین ادب جو درجہ ان کی ملاقات کے لیے آتے رہتے تھے بلکہ بعض ناگزیر دیوہات کی بنا پر داغ نے حیدر آباد کو تجرید کہا۔ احسن مارہروی، غلام صمدانی گوہر اور کلب علی خاں خاں خاں لکھتے ہیں کہ حیدر آباد کے اخراجات سے گھبرا کر داغ نے یہاں کی سکونت ترک کی تھی اور اپنے وطن واپس ہو گئے تھے۔ نظام کے مقربین اور مزاج شناس داغ کو یقین دلاتے رہے کہ اُن کا تقرر ہو چکا ہے لیکن وائی ریاست کی جانب سے کوئی امید افزا ربات سنوڑ سننے میں نہیں آئی تھی۔ داغ اپنے ساتھ جو رقم لائے تھے وہ خرچ ہو چکی تھی اس کا حال کنور اعتماد علی خاں کو اپنے مکتوب مورخہ ۲ جولائی ۱۸۹۹ء میں اس طرح تحریر کیا ہے :-

”میں اپنی زندگی سے زیادہ آپ کی دعا مانگتا ہوں کہ آپ ہی بیٹ کی خبر لے رہے ہیں۔ معاملہ معلومہ کا خیال رہے جس کا وعدہ مہینہ بھر کا ہے ورنہ زہر کھانا پڑے گا۔ میں باہر نہیں نکلتا کہ قرض خواہ تکلیف دیتے ہیں۔“ لکھ

شاہ دکن میر محبوب علی خاں پر داغ کی شاعری کا جادو چل گیا تھا۔ ترک محبوبیہ (جلد دوم) سے پتہ چلتا ہے کہ نواب داؤد الملک بہادر کے ذریعے سے اُنھوں نے داغ کو حیدر آباد آنے کی دعوت دی تھی اور دس ماہ بعد داغ واپس ہوئے تھے لیکن تمکین کاظمی کا بیان ہے

۱۔ احسن مارہروی۔ منتخب داغ۔ حصہ اول۔ مقدمہ صفحہ ۴۰۔

۲۔ صفحہ ۴۵۔

۳۔ مقدمہ ہفتاب داغ۔ صفحہ ۸۳۔

۴۔ رفیق مارہروی زبان داغ۔ صفحہ ۱۰۱۔

۵۔ شاعر علی شہرت نے آئینہ داغ میں واحد الملک تحریر کیا ہے جو درست نہیں ہے۔ صفحہ ۴۶۔

داغ حسب فرمان حاضر دربار ہوئے اور نذر پیش کی لہ جب آصف ششم کی پیشی میں باریابی کا شرف حاصل ہوا تو اپنے ورود حیدر آباد کی حسب ذیل تاریخ داغ نے نظام کے ملاحظے میں گزرائی تھی۔

قدم بوس حضرت کا حاصل ہوا
 بڑے شوق سے اور ارمان سے
 حضور کی تاریخ پوچھیں اگر
 یہ کہہ دو ”مے داغ سلطان سے“
 ۱۳۰۵ھ

آخری مصرعے کے الفاظ ”مے داغ سلطان سے“، ۱۳۰۵ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ یہ داغ کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں حضور نظام کی استاد کی اعزاز عطا ہوا اور چودہ پندرہ سال تک برابر وہ سلطان دقت کے کلام کی نوک پلک درست کرتے رہے۔ آصف سادس کو بقول نصیر الدین ہاشمی شاعری سے بڑا شغف تھا۔ مے اور وہ اس خیال کے حامل ہیں کہ استاد کی غزل گوئی سے اثر پذیری میر محبوب علی خان آصف کے کلام میں اکثر جگہ چھلک گئی ہے۔ کلام آصف میں محاورہ و روزمرہ کا برجستہ استعمال، عاشقانہ مضامین اور رنگین خیالی داغ کا فیضان معلوم ہوتی ہے۔

میر محبوب علی خاں دلی ریاست حیدر آباد کی مسند کے قریب صرف مخصوص امراء عظام اور چند خاص عہدیداروں کو نشست کی اجازت تھی اور ان ہی میں داغ بھی تھے۔ جب آصفی دربار میں ریڈنٹ آتے تو کرسیاں بچھادی جاتیں جن کی دو صفیں ہوتیں اور وسط میں نظام اور ریڈنٹ بیٹھے دوسری طرف ریاست کی سربراہ اور وہ شخصیتیں تشریف فرما ہوتیں اور داغ کو یہیں جگہ دی جاتی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نظام کے

دربار میں استاد شہہ ہونے کی وجہ سے داغ کی کیا قدر و منزلت تھی اس کے باوجود داغ کبھی ملی
کے بغیر دربار میں حاضر نہیں ہوئے اور خوشامد و تملق سے ہمیشہ دور رہے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ
میں وضع کا پابند ہوں مگر جان بھی جائے
جب کوئی بلانے نہیں آتا نہیں جاتا

حیدر آباد میں داغ عزت، شہرت اور دولت سب ہی نعمتوں سے بہرہ یاب ہوئے
خوش بختی اُن کے قدم چومتی رہی لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رامپور کی پُر لطف محفلوں کی
یاد نادم مرگ داغ کے دل سے محو نہ ہو سکی تھی چنانچہ داغ کی ایک غزل سے جو اُنھوں نے
امیر مینائی کو بھیجی تھی اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ داغ کہتے ہیں کہ

یاد آتے ہیں وہ اشخاص مصاحب منزل
دو گھڑی جلسہ وہ احباب کہ شامل اپنا
نہیں اکثر کا پتہ اور جو کچھ باقی ہیں
اُن سے ملنے کو تڑپتا ہے بہت دل اپنا

امیر مینائی ۵ ستمبر ۱۹۱۷ء کو حیدر آباد آکر داغ کے مہمان ہوئے تھے۔ لیکن قضا و قدر
نے اُنھیں یہاں زیادہ قیام کی اجازت نہیں دی اور ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو اس دار فانی
سے رخصت ہو گئے اور موت نے ”غربت میں“ مینائے امیر ”کوڑ ڈالی“۔ داغ نے اپنے
دیرینہ احباب کی مفارقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ
داغ اس ضعف نے کی اپنی تو منزل کھوٹی

ہم رہے جاتے ہیں سب یار چلے جاتے ہیں

”دکن ریلوی“ ۱۹۱۷ء میں داغ کے انتقال کے بعد فضل حق آزاد عظیم آبادی نے ایڈیٹر
کی فرمائش پر اپنی نظم ”امیر مرحوم“ اشاعت کے لیے روانہ کی تھی جس کے آخری دو
اشعار میں وہ کہتے ہیں کہ امیر مینائی حیدر آباد میں پہلے داغ کے مہمان ہوئے تھے۔

فہرست

حرفِ آغاز

مقدمہ

- | | | |
|-----|---------------------------------|------------------------------------|
| ۹ | ڈاکٹر صادق | ۱۔ داغ کی شخصیت اور سیرت |
| ۱۳ | ڈاکٹر کامل قریشی | ۲۔ داغ لال قلعہ میں |
| ۳۳ | ڈاکٹر خلیق انجم | ۳۔ داغ حیدر آباد میں |
| ۳۲ | پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی | ۴۔ داغ کی حیاتِ معاشرہ |
| ۵۹ | ڈاکٹر سیدہ جعفر | ۵۔ داغ کا نظریہ، فن |
| ۷۷ | پروفیسر نثار احمد فاروقی | ۶۔ داغ اور مذاقِ سخن |
| ۹۰ | پروفیسر ظہیر احمد صدیقی | ۷۔ داغ کی غزل گوئی |
| ۱۰۸ | ڈاکٹر اسلم پرویز | ۸۔ داغ کی تاریخ گوئی |
| ۱۰۸ | ڈاکٹر کامل قریشی | ۹۔ خصوصیاتِ کلام داغ زبان و محاورہ |
| ۱۲۷ | ڈاکٹر مغیث الدین فریدی | ۱۰۔ مکاتیب داغ |
| ۱۳۶ | سید ضمیر حسن دہلوی | ۱۱۔ داغ کے اثرات اقبال پر |
| ۱۳۹ | پروفیسر عتیق احمد صدیقی | ۱۲۔ داغ کے دہلوی تلامذہ |
| ۱۶۷ | پروفیسر جگن ناتھ آزاد | ۱۳۔ داغ کا دبستانِ شاعری |
| ۲۰۲ | جناب آتمہ موہن زشتی گلزار دہلوی | |
| ۲۲۱ | ڈاکٹر صلاح الدین | |

لیکن اب ریاضِ غلد میں داغ امیر مینائی کے مہمان ہوئے ہیں۔
 ہوئے تھے داغ کے مہمان اب جو سنتا ہوں
 ہوئے ہیں حضرت داغ آپ مہمان امیر
 ریاضِ غلد میں آزاد کیا مرے ہوں گے
 ادھر امیر ادھر داغ ہم زبانِ امیر
 داغ کو حیدر آباد کی پرسکون اور پر مسرت زندگی میں اپنے جن احباب کی جدائی کا قلق
 رہا ان میں امیر مینائی اور جلال شامل تھے داغ کہتے ہیں کہ
 اے داغ ہے دکن سے بہت دور کھنوا
 ملتے امیر احمد و سید جلال سے

نومبر یا دسمبر ۱۸۹۶ء میں داغ نے اپنی رفیقہ حیات کو حیدر آباد بلا لیا تھا۔ وہ
 حیدر آباد میں داغ کے ساتھ سات سال اور چند ماہ سے زیادہ عرصہ نہ رہ سکیں اور جب
 ۱۲۱۶ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا جس کا داغ کو بڑا صدمہ تھا اور افسوس
 نے مدتوں اس کا سوگ منایا۔ امیر مینائی کے تعزیت نامے کے جواب میں جو خط ام اشعبان
 ۱۲۱۶ھ کو تحریر کیا ہے اُس سے واضح ہوتا ہے کہ انھیں اپنی شریک زندگی کے انتقال کا کس قدر
 صدمہ تھا۔

جنوری ۱۹۰۳ء میں ایڈورڈ ہشتم کی تاج پوشی کی مسرت میں دہلی میں دربار منعقد
 ہوا تو حضور نظام نے بھی اس میں شرکت کی اور صرف چند مخصوص عمائدین سلطنت اُن
 کے ہم رکاب تھے۔ داغ اس جشن میں میر محبوب علی خاں کے ساتھ رہے۔ جب سے داغ
 نے دلی چھوڑی تھی یہاں آنے کا موقعہ ہی نہیں ملا تھا۔ حیدر آباد کی ملازمت کے بعد یہ

۱۸۹۶ء وفات کا سنہ و وفات ۱۸۹۶ء تحریر کیا ہے جس کی دوسرے
 ماخذوں سے تردید ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو زبانِ داغ۔ صفحہ ۳۳۔

۱۸ محمد علی زیدی۔ مطالعہ داغ۔ صفحہ ۱۰۱۔

داغ کا پہلا سفر دتی تھا۔ وہ جب تک جشن تاجپوشی کے سلسلے میں دتی میں مقیم رہے اپنے قدیم احباب، پرستاروں اور عزیز و اقارب سے ملاقاتیں کیں اور یہی ان کا آخری سفر دہلی تھا۔ ابتداءً داغ کی تنخواہ بقول احسن مارہروی ساڑھے چار سو روپیہ ماہانہ مقرر ہوئی تھی اور تین برس تک یہی ماہوار ملتی رہی جس میں امیدواری کا زمانہ بھی شامل تھا۔ تزک محبوبیہ کے مصنف رقمطراز ہیں کہ ۲۰ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ کو ایک مراسلہ نمبر ۵، پولیٹکل و فینانس جاری کیا گیا تھا جس کی رو سے ساڑھے چار سو سکہ حالی داغ کے نام ابتداءً درود حیدر آباد سے جاری کیے گئے تھے۔ ۱۳۱۷ھ میں ساڑھے پانچ سو کا اضافہ ہوا اور اس طرح جملہ ایک ہزار روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا۔ سکہ جو داغ تادم زلیست پاتے رہے۔ ایک ہزار روپیہ کا حساب بھی امیدواری کے زمانے سے کیا گیا تھا جس کی جملہ رقم چالیس اکتالیس ہزار ہوئی تھی لیکن داغ نے یہ عذر کہہ کر رقم واپس کر دی تھی کہ میرے پاس اتنی رقم رکھنے کی جگہ نہیں شاہی خزانے ہی میں محفوظ رہے گی۔ اس ہرجت شاہی کی تاریخ داغ نے اس طرح کہی تھی سہ

ہو گیا میرا اضافہ آج دو نے سے سوا
یہ کرم اللہ کا ہے یہ عنایت شاہ کی
اس اضافے کی کہو اے داغ یہ تاریخ تم
ابتداءً سے اپنی ساڑھے پانچ سو نقدی بڑھی

اصف جاہی دربار سے استاد کی کاشف عطا ہونے کے بعد دوسرے اعزازات سے بھی داغ کو نوازا گیا۔ جہاں استاد نواب فصیح الملک، ناظم یار جنگ

۱۔ احسن مارہروی۔ منتخب داغ۔ مقدمہ۔ صفحہ ۴۔
۲۔ غلام صدیقی گوہر۔ تزک محبوبیہ حصہ دوم۔ صفحہ ۳۳۔
۳۔ احسن مارہروی۔ منتخب داغ۔ مقدمہ۔ صفحہ ۴۔

اور دبیر الدولہ خطابات سے سرفراز ہوئے۔ اُن خطابات میں سے صرف فصیح الملک کو داغ اپنے دستخطوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ راقمہ الحروف نے تلاش بسیار کے بعد محکمہ آثار قدیمہ حیدرآباد کی پرانی فائیلوں سے داغ کے خطابات کی تفصیل حاصل کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداً داغ کا خطاب ناظم جنگ تجویز کیا گیا تھا لیکن ”یہ امین جنگ کے علاقے کا خطاب تھا“ لہذا ناظم یار جنگ خطاب قرار پایا۔ ”نختہ سرفرازی مناصب و خطابات“ کے الفاظ ”بتقریب جشن سالگرہ مبارک بتاریخ ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ“ سے پتہ چلتا ہے کہ میر محبوب علی خان کے جشن سالگرہ کے موقع پر ”خانی و بہادر ناظم یار جنگ دبیر الدولہ فصیح الملک بلبل ہندوستان اور جہاں استاد“ کے خطابات عطا ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ منصب چہار ہزاری و سہ ہزار سوار و علم و نقارہ سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔ آصف سادات نے داغ کو ایک گاؤں بھی عنایت فرمایا تھا جسے حیدرآباد کی اصطلاح میں مقطعے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور تنزک محبوبیہ کے بیان کے مطابق ایک بارغ بھی مرحمت فرمایا تھا۔

داغ کی جو قدر و منزلت حیدرآباد میں میر محبوب علی خاں نے کی وہ اُن سے پہلے اور اُن کے بعد کسی استاد شہہ کی نہیں ہوئی۔ داغ شاہی علی کے رکن تھے اور امرائے عظام کی طرح اُنھیں دربار میں بلایا جاتا تھا۔ نظام حیدرآباد سے اُنھیں ایسا تقرب حاصل ہو گیا تھا کہ سفر و حضر اور شکار میں ہر وقت داغ ساتھ رہتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۹۹ء میں جب آصف ششم نے کلکتے کا سفر کیا تو داغ بھی ساتھ تھے داغ نے اپنے اکثر اشعار میں اپنی اس خوش نصیبی کا ذکر کیا ہے۔

ہے لاکھ لاکھ شکر کہ اے داغ
آرام سے گذرتی ہے شاہ دکن کے پاس

۱۔ تشار علی شہرت نے آئینہ داغ میں اس کو امیر الدولہ لکھا ہے جو غلط ہے۔ صفحہ ۴۸۔
۲۔ تختہ جات سرفرازی مناصب و خطابات درجین سالگرہ مبارک بابت ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۱۷ھ سلسلہ ۱۵۔
۳۔ غلام صمدانی گوہر جلد دوم۔ صفحہ ۳۳۔

کی مری قدر مثل شاہِ دکن
کسی نواب نے نا راجہ نے

شاہ میرا قدر داں احباب میرے مہربان
میں دکن میں جب سے ہوں اے داغ اک جنت میں ہوں
حیدر آباد میں داغ کا قیام کم و بیش سترہ سال رہا لیکن انھوں نے اپنے لیے کوئی
مکان تعمیر نہیں کروایا۔ دوست احباب اگر اُن کے سامنے ذاتی مکان تعمیر کروانے یا خریدنے
کا ذکر کرتے تو وہ ٹال جاتے۔ داغ یہ چاہتے تھے کہ خود میر محبوب علی خاں انھیں کوئی مکان
عنایت فرمائیں چنانچہ اپنے ایک شعر میں انھوں نے اس تمنا کا اس طرح اظہار کیا ہے
حضور دیں گے تمہیں چند روز میں اے داغ
اٹھاد اور کوئی دن مکان کی تکلیف

حیدر آباد میں داغ کی مقبولیت کا سبب اُن کی شاعرانہ عظمت کے علاوہ اُن کی
خوش اخلاقی اور ملنساری بھی تھی۔ داغ نے کہا تھا
ملنساری بھی سیکھو جب نگاہ نازیبا نہ ہے
میری جاں آدمی اخلاق سے تلوار جوہر سے
”دبیدہ آصفی“ ۶۲ لہجہ ۲۲ء میں داغ کے اخلاق و اشفاق کو بہت سراہا گیا ہے۔ اس کے
مہتمم داغ کے اخلاق کی ستائش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-
”مرحوم داغ کی یہ خوبی بھی قابلِ غور ہے کہ انھوں نے کبھی کسی کے کلام
پر اعتراض نہیں کیا اور نہ کسی معترض کو جواب دیا۔“

سرفراز علی دہشتی لکھنوی اسی عہد میں حیدر آباد آئے تھے اور بحیثیت استاد
سخن بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی جو مرزا داغ دہلوی کے حیدر آباد
آنے تک قائم رہی۔ داغ کے آگے حیدر آبادی شعرا کی شہرت ماند پڑ گئی
تو دہشتی اور اُن کے حیدر آبادی تلامذہ نے داغ سے مقابلے کا اعلان کر دیا لیکن

ناکام رہے۔ حیدر آباد میں بقول ڈاکٹر زورسلہ دبستان لکھنؤ کے حیدر آبادی شعرا داغ کی مخالفت کرتے رہے ان میں وصفی، واصل اور مائل پیش پیش تھے۔ یہ شعرا داغ سے مقابلے کی کوشش میں خود اعلیٰ پایے کے شاعر بن گئے واصل نے دعویٰ کیا تھا کہ

واصل ترقی دیں گے ہم اردو زبان کو

ملک دکن کو سند کا عیسر بنائیں گے

ملکی اور غیر ملکی اصطلاحوں میں سوچتے ہوئے مائل کہتے ہیں کہ

قدر مائل کی ہو کیوں کر کہ مائل دکن

وہ دکھاتا ہے یہی عیب ہنر سے پہلے

ایک شعر میں تو داغ پر علانیہ چوٹ کی ہے اور کہتے ہیں کہ

زباں کا بڑا جن کو دعویٰ ہے مائل

انہیں بھی تو آئی زبان آتے آتے

داغ نے ۳ جولائی ۱۸۸۳ء میں حجاب کو کھلتے میں اُس کے گھر پر خدا حافظ کہا

تھاٹھ کوئی ساڑھے انیس سال بعد حیدر آباد میں اپنے مکان پر ۱۸ یا ۱۹ جنوری ۱۹۰۳ء

کو حجاب کا خیر مقدم کیا۔ تملکین کاظمی ”معاشقہ داغ و حجاب“ میں لکھتے ہیں کہ ”یہ صرف

وضع داری اور دلگی تھی اس جذبہ تفریح کو محبت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ دونوں طرف

ایک ہی جذبہ کار فرما تھا۔ داغ اپنی دولت و ثروت اور عزت و امارت کا نقش حجاب

کے دل پر بٹھانا چاہتے تھے اور حجاب کی نظر دارنا کی دولت پر بھی تملکین کاظمی کے اس

بیان کی تصدیق داغ کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

داغ سے کہتے ہیں سب دید و مجھ

جو ملا ہے تم کو آصف جاہ سے

لے داستانِ ادب حیدر آباد۔ صفحہ ۱۵۲۔

لے تملکین کاظمی۔ معاشقہ داغ و حجاب۔ صفحہ ۶۸۔

” ” ” ” ” ” ” ”

لیکن رفتہ رفتہ داغ اور حجاب کی کشیدگی بہت بڑھ گئی جس کا ایک سبب اختر جان بھی تھی جو گانا سنانے پر داغ کے یہاں ملازم تھی اور اُسے ماہانہ تنخواہ ارسال کی جاتی تھی۔
 ”انشائے داغ“ میں اختر جان کی مدت ملازمت ڈیڑھ سال بتائی گئی ہے۔ لہ داغ نے حجاب کے لیے علیحدہ مکان کا انتظام کر دیا اور ابتداءً ساٹھ روپے اور پھر سو روپے ماہوار مقرر کر دی گئی۔ لہ لیکن حجاب کی ضرورتیں اتنی قلیل رقم سے کیسے پوری ہوتیں اپنے ایک خط میں داغ حیدر آباد کے امیر حسن علی خاں کو جن سے اُن کے خاص روال بط تھے اور جو داغ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے لکھتے ہیں :-

”حجاب کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔ آئے دن سرگراں رہتی ہے۔ وہ ہنسی دلی وہ ٹھٹھول سب غائب..... کل اختر جان کے باب میں دیر تک جھگڑا کرتی رہیں۔ گانا سننے کا نہ صرف مجھے شوق ہے بلکہ موسیقی کا دیوانہ ہوں ان ناچاچیوں میں میری یہ خواہش کیسے پوری ہو.....“

الہی تو نے حسیتوں کو کیوں کیا پیدا
 کچھ ان کی ذات سے دنیا کا انتظام نہیں سہ

اگست ۱۹۰۴ء کو حجاب کلکتہ واپس چلی گئی۔

نوح ناردی لکھتے ہیں کہ نواب میر محبوب علی خاں آصف بڑے زرد گو شاعر تھے۔ اپنی سیاسی مصروفیات کے باوجود بعض وقت دن میں کئی کئی غزلیں لکھ ڈالتے۔ چوہدری متعدد بار داغ کی کوٹھی پر آتا۔ سر بہر لفظ میں غزل بھیجی جاتی تھی۔ کلام الملوک، ملوک الکلام ہوتا ہے۔
 نوح ناردی سے داغ نے کہا تھا کہ بادشاہوں کے اشعار کی اصلاح کے آداب یہ ہیں کہ دست مبارک سے لکھے ہوئے الفاظ کو قلندر نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے اوپر اصلاحی لفظ یا

لہ احسن مارہروی۔ فصل دوم۔ صفحہ ۷۸

لہ تلکین کاظمی معاشقہ داغ و حجاب۔ صفحہ ۸۲۔

لہ (د) مسودہ خطوط داغ۔ مرتبہ رفیق مارہروی (د) تلکین کاظمی۔ معاشقہ داغ و حجاب۔ صفحہ ۸۴۔

مصرعہ تحریر کر دیا جاتا ہے بلکہ حیدر آباد اور بیرون ریاست میں داغ کے بلامبالغہ سینکڑوں شاگرد تھے۔ نور اللہ محمد نوری نے داغ کے تلامذہ کی تعداد پانچ ہزار سے زائد بتائی ہے اور فوج ناروی داغ کے شاگردوں کی تعداد تقریباً دو ہزار بتاتے ہیں۔ سخاوت مرزا نے کچھ نقشین میدری کے حوالے سے لکھا ہے کہ داغ کے پاس تلامذہ کا باقاعدہ رجسٹر موجود ہوتا جس میں شاگرد کا نام پیشہ، پتہ اور دیگر تفصیلات درج ہوتیں۔

آخری ایام حیات میں داغ کی صحت خراب رہنے لگی تھی اور نقرس کا درد اکثر پریشان کرتا رہتا تھا چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

جو گذرتی ہے ہم کہیں کس سے
تنگ آئے ہیں درد نقرس سے

”دبدبہ آصفی“، ۱۲۲ھ میں داغ کے مرض الموت کی تفصیل شائع ہوئی تھی، مہتمم لکھتے ہیں کہ داغ آٹھ دن تک بستر علالت پر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے بائیں جانب فالج کے حملے کی وجہ سے جسم کا ایک حصہ بے حس ہو گیا تھا۔ عبد المجید آزاد کا بیان نور اللہ محمد نوری نے نقل کیا ہے کہ داغ کو آخری زمانہ حیات میں اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی اور انھوں نے آزاد سے کہا تھا ”اب مجھے عطر کی بو محسوس نہیں ہوتی، گانا سنوں تو وحشت ہونے لگتی ہے۔ غزل کہنے اور سننے سے طبیعت دور بھاگتی ہے۔۔۔۔۔ یہ سب اس بات کا ثبوت ہے کہ میری زندگی کے دن ختم ہو چکے ہیں۔“

ہوش و حواس تاب و تلوں داغ جا چکے اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا ہے
داغ نے قمری حساب سے ۷۶ سال اور شمسی حساب سے ۴۴ سال عمر پائی تھی یہ

۱۷ نور ناروی۔ ”قصص الملک حضرت داغ دہلوی“، دہلی، رسالہ نگار داغ نمبر ۲۵، صفحہ ۲۷۔
۱۸ داغ۔ صفحہ ۱۷۷۔

۱۹ نمبر ۹۔ جلد ۸۔ صفحہ ۲۹۔

۲۰ داغ دہلوی۔ صفحہ ۲۴۔

۲۱ احسن مارہروی نے یادگار داغ میں انتقال کے وقت داغ کی عمر ۷۶ سال بتائی ہے۔ صفحہ ۲۰۔
۲۲ محمد علی زیدی۔ مطالعہ داغ۔ صفحہ ۱۰۴۔

۹ ذی الحجہ ۱۲۲۲ھ کی شام داغ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ رفیق مارہروی نے ”بزم داغ“ میں داغ کے زمانہ علالت کی تفصیلات درج کی ہیں۔ آصف سادس کو اپنے استاد کی رحلت کی خبر سن کر بہت ملال ہوا تھا اور انھوں نے داغ کی شایان شان تجہیز و تکفین کے لیے خزانہ شاہی سے تین ہزار روپے روانہ کیے تھے۔ مخطوط ”یادگار ضعیف“ میں جو ہنوز شائع نہیں ہوا ہے داغ کے انتقال کا دن عید الفطر بھی تحریر کیا گیا ہے جس کی تمام دوسرے مآخذوں سے تردید ہوتی ہے۔ یہ عید انصاری کی صبح کو داغ کی نماز جنازہ حیدر آباد کی تازگی مکہ مسجد میں ادا کی گئی اس مسجد کا سنگ بنیاد گوکنڈے کے چھٹے حکمران اور محمد قلی قطب شاہ کے جانشین محمد قطب شاہ نے رکھا تھا۔ درگاہ یوسفین میں داغ اپنی رفیقہ حیات کی قبر کے پہلو میں سپرد خاک ہوئے۔ درگاہ یوسفین میں مشرقی جانب نقار خانے کے قریب امیر مینائی آسودہ ہیں تو درگاہ کے صحن میں مغرب کی طرف اس کے متوازی داغ دہلوی کا مزار ہے۔ داغ کی وفات پر بقول احسن مارہروی یوں تو ان کے شاگردوں اور ہم عصر شعراء نے ہزاروں کی تعداد میں تاریخیں لکھی تھیں لیکن ان میں ”نواب مرزا داغ“ ایک ایسی انوکھی تاریخ ہے جس میں نام اور تخلص ہی سے تاریخ وفات اخذ کی گئی ہے۔

سرور جہاں آبادی نے اپنے مرثیے میں داغ کو لالے اور امیر مینائی کو گل شبو سے تشبیہ دیتے ہوئے خاک دکن سے مخاطب ہو کر کہا تھا:۔
 داغ و امیر کے لب اظہار بھیج دے
 نطق فصیح و شوخی گفتار بھیج دے
 تاج سخن کے گوہر شہوار بھیج دے
 منگواتے ہیں نظام کی سرکار بھیج دے

ان موتیوں کو خاک دکن کیا کرے گی تو
 کس پر نثار یہ در بیکت کرے گی تو

۱۔ بزم داغ۔ صفحہ ۲۳۹-۲۴۶۔

۲۔ مخطوط نمبر ۵۶۴-ادارہ ادبیات اردو۔ صفحہ ۲۳۸۔

۳۔ احسن مارہروی۔ منتخب داغ۔ جلد اول۔ مقدمہ۔ صفحہ ص۔

داغ کی حیاتِ عاشقہ

وہ موسم گرما کی ایک ستاہٹوں بھری شام تھی میں اپنے ایک رفیق کے ساتھ سائیکل رکشا پر سوار کوٹر کھاڑ راستوں سے گزر کر ایک دیران اورستان باغ میں داخل ہوا۔ سامنے ایک کشادہ ہتھالی تھی اور بیچوں بیچ ایک عالی شان انگریزی وضع کی عمارت۔ ہم نے اندر جانے کے لیے ایک نیم وادروانہ کھولا تو پہلے اس ہال میں ایک ایسی آواز گونجی جیسے کوئی بہت تیزی سے نوبت بجادے پھر ہمارے اندر داخل ہوتے ہی دو بڑے جہازی سائز کے آؤپر پھڑپھڑاتے ہوئے ہمارے اوپر سے اڑ گئے۔ میں نے مجازی آؤ تو قد آدم بھی بہت دیکھے ہیں، مگر لغوی آؤ اتنے تن و توش کے آج پہلی بار دیکھے۔ اس ہال سے کچھ عبرت کا سبق پڑھتے ہوئے ہم دوسری جانب نکل گئے، تو ادھر بھی ایک وسیع ہتھالی دیکھی جس کے نیچے سے ایک بڑی ہنر نکل رہی تھی مگر اب اسے جاری نہیں کہہ سکتے، غم فراق کے مارے ہوئے عاشق کی آنکھوں کی طرح دیران اور سوکھی پڑی تھی۔ اس ہال کو دیکھ کر تو فارسی کا یہ شعر یاد آیا تھا کہ

پرمودہ داری میکند بر طاق کسریٰ عنکبوت
چغد نوبت می زند برگنبد افراسیاب

اب اس سوکھی نہر کو دیکھا تو تصورات کے بحرے میں بہتا ہوا ماضی کی پُر اسرار دادیوں میں پہنچ گیا۔ نواب مرزا خاں داغ کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی:

ہو چکا ذکرِ غلہ اے واعظ

وہ بھی کیا بے نظیر باغ ہوا

جی ہاں یہی وہ بے نظیر باغ تھا جہاں داغ، امیر، جلال، بحر، منیر، جان صاحب اور ایسے ہی کتنے جلیل القدر استادوں نے رت جگے کیے تھے، مہر حق کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھ لیا تھا جہاں ساری فضا کبھی نکھت و رنگ اور نغمہ و آہنگ سے معمور رہتی تھی، آج وہ گنبدِ افلاک میں غلغلہ ڈلنے والے وادٹی خموشاں میں دم سادھے پڑے ہیں اور اس باغ کا ایک ایک ورق زبانِ حال سے اُن کی داستانِ پارینہ سن رہا ہے۔ اسی باغ میں داغ نے پیستکیں بڑھائی تھیں۔ گلزارِ داغ اور آفتابِ داغ کی کتنی ہی غزلیں یہاں لکھی یا سنائی گئی ہوں گی۔

نواب مرزا خاں داغ دہلوی ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء / ۱۳ ذی الحجہ ۱۲۴۹ھ کو بدھ کے دن دہلی کے محلہ چاندنی چوک میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ کوچہ آج تک استادِ داغ کے ہی نام سے مشہور ہے۔ ان کی ماں وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم ایک کشمیری سادہ کار محمد یوسف کی بیٹی تھیں اگرچہ خاندانِ لوہار دے کبھی داغ کو نہیں اپنایا، مگر عام طور پر یہی روایت رہی ہے کہ داغ کے والد نواب شمس الدین خاں وائی فیروز پور بھر کا تھے جنھیں ولیم فریئر کو قتل کرانے کے الزام میں پھانسی دی گئی تھی، اُس وقت داغ کی عمر ۶ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ ۱۸۴۴ء میں چھوٹی بیگم نے بہادر شاہ ظفر کے بڑے بیٹے اور ولی عہد مرزا فخر سے نکاح کر لیا تو داغ بھی قلعہ معلیٰ میں پہنچ گئے۔ بچپن کا وہ زمانہ جس میں پورے مستقبل کا خاکہ تیار ہو جاتا ہے انھوں نے قلعے کے ماحول میں گزاریا، یہیں ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے میر تقی میر کے شاگرد غلام حسین شکیبا کے بیٹے میر احمد حسین سے ابتدائی فارسی پڑھی اور میر تقی میر کے شاگردوں سے خوشنویسی کا فن سیکھا۔ اس زمانے کے دوسرے فنون مثلاً بانک بنوت، پیٹ، تیراندازی، شہسواران اور بندوق چلانا بھی وہیں سیکھا۔ قلعہ اب برائے نام رہ گیا تھا یا دشاہ خود کٹرہ نیل کے مہاجنوں سے اُدھار لے کر کام چلاتے تھے

حرف آغاز

دلی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے عالم میں انتخاب اس شہر بے عدیل کی تاریخ و تہذیب علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جاسکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبان دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زورِ سایہ نشوونما پا کر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیش نظر محترمہ اندرا گاندھی کے ایما پر (جو اس وقت ملک کی وزیراعظم تھیں) ۱۹۸۱ء میں دلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعال ترین اداروں میں ہوتا ہے اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کابھائے نمایاں انجام دے رہی ہے، ان سے پوری اردو دنیا واقف ہے۔ نہ صرف دلی بلکہ پورے ملک یہاں تک کہ بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی مقبولیت حاصل ہے۔ یہاں یہ اعتراف ضروری ہے کہ اس کام میں اکادمی کو دلی سرکار کا فراخ دلانہ تعاون حاصل رہا ہے۔

اکادمی کے دستور العمل کی رو سے دلی کے لیفٹیننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے دلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دلی کے وزیراعلیٰ ہو گئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور معلموں میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور انھیں رو بہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دلی اور بیرون دلی کے دیگر اردو اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

پھر بھی وہاں ایسا ماحول تھا جس میں عیش پسندی، لذت کوئی اور زندگی سے لطف اندوزی کا رجحان پرورش پاتا تھا۔ اس چھیل چھیلے ماحول میں داغ نے ہوش سنبھالا تھا۔ سب سے آسان اور مستانہ شاعری کا تھا، نغمہ عندلیب اور گلستانِ سخن جیسے تذکروں سے باسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ قلعہ میں شعر و شاعری کا کیسا چرچا تھا۔ داغ نے بھی اس ماحول کا اثر قبول کیا۔ زبان تو قلعہ معلیٰ کی باندی تھی، روزمرہ وہاں کا چاکر تھا، استاد ذوق موجود ہی تھے، گانے بجانے اور آنکھ لڑانے کے مواقع بھی سب مہیا تھے، طبع رسا نے بچپن ہی سے جوہر دکھانے شروع کر دیے۔ داغ کی ایک خالہ عمدہ بیگم تھیں ان کا ربط نوبان رام پور سے بھی تھا اور رامپور کے صاحبزادگان بھی دہلی کے محلہ روشن پورہ (نئی سڑک) کی ایک عالی شان حویلی میں رہتے تھے چنانچہ نواب یوسف علی خاں ناطم (ولادت ۵ مارچ ۱۸۱۶ء) اور نواب کلب علی خاں (ولادت ۱۹ اپریل ۱۸۳۵ء) روشن پورہ ہی میں پیدا ہوئے تھے ۱۸۵۵ء میں قلعہ کی بساط اُلٹ گئی تو داغ کی ماں نے دوسرا نکاح کر لیا اور یہ اپنی خالہ کی نگرانی میں رہے۔ اس تقریب سے ان کا رام پور سے تعلق پیدا ہوا۔ بقول خود داغ نے ۵۲ برس تک رام پور کا نمک کھایا۔ قلعہ معلیٰ کے اُبڑنے کے بعد یہی دو چار ریاستیں تھیں جو کسی باکمال کی قدر دانی اور کفالت کر سکتی تھیں۔ داغ کی پرورش بھی ریاست رام پور نے کی اور ۱۸ اپریل ۱۸۶۲ء کو ان کا تقرر، روسیہ ماہانہ پر باقاعدہ ہو گیا۔ اصطبل اور فرش خانہ وغیرہ کی نگرانی ان کو سونپی گئی۔ اس وقت کسی مسخرہ نے ایک شعر لکھ کر اصطبل کے دروازہ پر چپکا دیا تھا:

شہر دہلی سے آیا اک مشکلی

آئے ہی اصطبل میں داغ ہوا

اس وقت رام پور میں شاعروں کا اور موسیقی کے ماہروں کا بڑا اچھا جھگڑ ہو گیا تھا۔ یہ نہیں دوسرے بہت سے فنون کے باکمال بھی وہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ نواب احمد علی خاں نے ۱۸۶۲ء میں شہر سے تین میل جانب شرق یہ بے نظیر باغ کی کوٹھی بنوائی تھی، نواب کلب علی خاں نے اس باغ میں ایک میلے کی طرح ڈانی جو مارچ کے آخری ہفتے میں ہوتا تھا اور کبھی اپریل کے پہلے ہفتے تک جاری رہتا تھا۔ اس میں ۸-۱۰ دن تک ایسا جشن رہتا تھا کہ اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔ کوٹھی کو دہن کی طرح سجایا جاتا تھا۔ سارے باغ میں روش روشن

پر چراغاں ہوتا تھا، نہر کے دونوں جانب مٹیاں باندھ کر قندلیں اور فانوس روشن کیے جاتے تھے۔ ہفتائی پر محفل رقص و سرود اور مشاعرے آراستہ ہوتے تھے، رات کو نواب صاحب اپنے نہایت شاندار بجرے پر سوار ہو کر آہستہ آہستہ نہر میں سیر کرتے ہوئے چلتے تو بھانت بھانت کے موسیقار اور سازندے نہر کے دونوں کناروں پر کھڑے ہو کر اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ چراغاں کا عکس پانی میں جھلک کر تا ہوا عجیب لطف پیدا کرتا تھا۔ باغ میں سینکڑوں ڈیرے، راوٹیاں اور تنبوتان دیے جاتے تھے جن میں یہ فنکار اور مہمان قیام کرتے تھے۔ کہیں اکھاڑے بنے ہیں اور گرجہ و جوان زور بھر رہے ہیں، کہیں بانک اور پٹے کے مظاہرے ہو رہے ہیں، کہیں چہار بیتوں کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ ایک طرف کوئی داستان گو اپنی مسند بچھائے بیٹھا ہے گھوڑا گھونسا جاتا ہے اور زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے داستان ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتی۔ جلد ہی اس بے نظیر باغ کے میلے کی سارے ملک میں دھوم مچ گئی اور دور دور سے ہر فن مولا قدر دانی کی توقع پر کھینچ کر آنے لگے۔ یہ میلہ رام پور کا ایک قومی جشن بن گیا تھا۔ اسی کو نواب رضا علی خاں نے ۱۹۴۲ء سے رام پور کی نمائش مصنوعات میں تبدیل کر دیا۔

مارچ ۱۸۸۱ء کے اس بے نظیر میلے میں کلکتہ کی ایک ڈیرہ دار ماہ منیر بیگم عرف منی بانی بھی حاضر ہوئیں۔ یہ بڑی شوخ طرار حاضر جواب اور عشوہ فروش غارت گر صبر و ہوش مغنیہ تھی، کہتے ہیں کہ اس نے ایک محفل میں داغ ہی کی غزل گائی:

ترے وعدہ کو بت جیلہ جو نہ قرار ہے نہ قیام ہے
کبھی شام ہے کبھی صبح ہے کبھی صبح ہے کبھی شام ہے
اور جب مقطع تک پہنچی تو بار بار داغ کی طرف ہاتھ بڑھا کر پڑھتی تھی:
جسے داغ کہتے ہیں دوستو اسی رو سیاہ کا نام ہے

اس شوخی سے ساری محفل لوٹن کبوتر بن گئی اور خود داغ بھی ان اداؤں پر دل نچھادر کر بیٹھے منی بانی خیر سے شاعرہ بھی تھیں، اس شوخی و بے جانی کے با وصف جواب تلخ فرما تی تھیں اور عبدالغفور نساج کے شاگرد، پندہ (بنگال) کے ساکن مولوی عصمت اللہ تسخ سے عرصہ کلام

کی مشاطگی کراتی تھیں بعض نے یہ شرف خود نساخ کو بھی بخشا ہے۔ بہر حال مٹی بانیِ جہاں باقاعدہ شعر کہتی تھی اور ایک دیوان بھی فرمایا تھا۔ اس زمانہ کے متعدد تذکرہ شاعرات میں اُس کا نمونہ کلام موجود ہے۔ اس کے حسن و جمال اور ناز و انداز کا داغ نے یوں نقشہ کھینچا ہے:

جتنی جتنی بھنودوں کی وہ تحریر
کیوں نہ دل اس لکیر پر ہو فقیر

لگات بائگی بدن سڈول تمام
فتنہ قد، فتنہ چشم فتنہ خرام

سج دھج آفت، غضب تراش خراش
کسی اچھے کی دل ہی دل میں تلاش

گرتے گرتے کبھی سنبھل جانا
ادھر آنا ادھر نکل جانا
کبھی کچھ تیوری پہ بل دینا
کبھی آنکھیں دکھا کے چل دینا

ہے نرالی ادا زمانے سے
روٹھنا اور بھی منانے سے

ادھر اظہار درد رنج فراق
اور ادھر گفتگو تڑاق پڑاق

داغ آنکھ اور کان ددوں کے رسیا تھے۔ اچھی آواز اور اچھی صورت پر لٹو ہوا تھے

تھے۔ حجاب سے بھی پہلی ہی ملاقات میں ریشہ خصلی ہو گئے۔ وہ ایک ہی آنکھی زمانہ کو چٹکیوں میں اُڑانے والی اور ان ریسوں سے اُن کے چونچلوں کی پوری پوری قیمت وصول کرنے والی ڈیرہ دار طوائف تھی اس نے سوچا ہوگا کہ داغ ایک یا کمال شاعر تو ہیں ہی، اب یہ میرے برہے الاپیں گے تو اس سے بھی کمپنی کی مشہوری ہوگی اور جو کچھ ہاتھ آجائے وہ مالِ غنیمت ہوگا۔ داغ بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈورائے ہوئے تھے پورے خستہ و خنوع کے ساتھ عشق فرمانے لگے۔ اس عشق کے دو دروہیں، ایک زمانہ آغاز جب یہ —
 راجا ہرکشن بہادر میڈار سے ایک ہزار روپے قرض طلب کرتے ہیں اور کچھ دھاگے سے بندھ کر کلکتہ تک کھینچے چلے جاتے ہیں، دوسرا وہ زمانہ ہے جب نشاطِ عشق کی مستی جھڑ چکی ہے بس بھول ہی باقی رہ گیا ہے اس میں حجاب نے بہت کرید کر دیکھا تو ایک چنگاری بھی نہ نکلی۔

اگ تھے ابتدائے عشق میں ہم

اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

اس ابتدا کا حال تو ان کی مثنوی فریاد داغ میں نظم ہوا ہے پہلے اس کا مختصر سا بیان ہو جائے۔

مثنوی فریاد داغ ۸۳۸ - اشعار پر مشتمل ایک سوانحی مثنوی ہے یہ داغ نے سفرِ کلکتہ سے واپس آکر دودن ہی میں لکھ ڈالی تھی، ۱۸۹۷ء میں پہلی بار چھپی اور اتنی مقبول ہوئی کہ ۶ ماہ میں یہ ایڈیشن ختم ہو گیا۔ ۱۸۹۹ء تک یہ کم از کم چار بار چھپ چکی تھی۔ ہمارے سامنے مطبع مطبع العلوم مراد آباد کا چھپا ہوا پانچواں ایڈیشن ہے، اس کا آغاز حمد و ثناء سے ہوتا ہے۔ پھر کچھ اشعار نواب رام پور کی مدح میں ہیں:

سب اسے رام پور کہتے ہیں

ہم تو آرام پور کہتے ہیں

خیر نواب کی مناتے ہیں

جس کا کھاتے ہیں اس کا گاتے ہیں

اس کے بعد ”صفت عشق“ کے عنوان سے حضرت عشق کی منقبت لکھی ہے اور کہتے ہیں:

عشق کے کھیل ہم نے کھیلے ہیں

سو پریزاں ہم اکیلے ہیں

اس کے بعد ساتی نامہ شروع ہوتا ہے پھر اپنے مبتلا ہونے کا تذکرہ ہے:

آگیا بے نظیر کا میلہ

دل پابندِ وضع کھل کھلا

یار و غم خوار و مونس و ہمدم
کہہ رہے تھے تھے خدا کی قسم

داغ تو ماجرا بیان تو کر
تجھ کو کیا ہو گیا بیان تو کر

سوچو اپنا بُرا بھلا دیکھو
دیکھو نواب میرزا دیکھو

میلے کے دن پلک بھپکتے گذر گئے اور جدائی کی گھڑی سر پر آگئی۔ داغ اپنے محبوب کو رام پور میں روکنا چاہتے ہیں مگر کلکتہ کی رہنے والی کو رام پور میں مستقل رہ پڑنا کب بھلا لگ سکتا تھا وہ کہتی ہے:

ذر سے معمور ہے ہمارا شہر
کون سادو سرا ہے ایسا شہر

ہے حکومت کی شان کلکتہ
سلطنت کا نشان کلکتہ

زندگی شرط ہے تو آئیں گے
لطف صحبت کے پھر اٹھائیں گے

مصرع میر پڑھ کے فرمایا
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

ساتھ اس کے مری نگاہ گئی
جب نگہ تھک گئی تو آہ گئی
اُن کو رخصت کرنے کے بعد اپنی بیقراری اور آہ و زاری کا خاصا مفصل بیان کیا ہے۔
تیغ حسرت اُتر گئی دل میں
بیقراری ٹھہر گئی دل میں

اشک اندے برس گئیں آنکھیں
دیکھنے کو ترس گئیں آنکھیں

غم دوری سے جان بیکل ہے
آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے
داغ کا بیان ہے کہ ادھر بھی ایسی ہی آگ لگی ہوئی تھی، تنہائی میں تصویر سے مکالمہ
ہو رہا تھا:

میری تصویر رکھ کے پیش نظر
کو سنا چھڑنا یہ کہہ کہہ کر
اس ڈھٹائی سے تو ادھر دیکھے
آنکھیں پھوٹیں ہمیں اگر دیکھے

کس طرح گھورتا ہے بل بے شمیر
جی میں آتا ہے پھونک دوں تصویر

ایسی تصویر کس کو بھاتی ہے
پر بلا سے ہنسی تو آتی ہے

تجھ سے رولت نہیں ہے گھر کے لیے
رکھ لیا ہے نظر گذر کے لیے
غرض کچھ دن یہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ اب میلے کی تاریخیں پھر قریب آنے لگی
تھیں حجاب کو بہت اصرار کر کے بلایا گیا، اس نے بھی دعوت قبول کر لی۔
آئے جس وقت وہ بنارس میں
میں نے جانا کہ آگئے بس میں

جا کے عہد شباب کا آنا
تھا دوبارہ حجاب کا آنا

نکبت گل ادھر پلٹ آئی
عمر رفتہ مگر پلٹ آئی

میرے غم خوار جا کے لائے انھیں
نہ بنی کچھ بنعیر آئے انھیں
پہلے کچھ بات کی تو رک رک کر
پھر کہا میرے کان میں جھک کر

کیا نہیں حسرت وصال ہیں
وضع داری کا ہے خیال ہیں

مام پور میں بھی داغ کے رقیب پیدا ہو گئے تھے۔ نواب حیدر علی خاں یسی ضلع بدایوں کے جاگیر دار تھے اور خاندان ریاست ہی سے تعلق رکھتے تھے وہ بھی حجاب سے بے حجابیاں کرتے تھے۔ داغ کی مالی حالت اس وقت اتنی اچھی نہ تھی جتنی بعد کو حیدر آباد میں ہو گئی تھی۔ یہاں تو وہ ستر روپے ماہانہ مشاہرہ پر اصطبل کے داروغہ تھے۔ حجاب کو مثنوی فریاد داغ لکھ کر یا غزل کا ایک خوں آٹام بے کمر معشوق بنا کر خوش کر سکتے تھے مگر وہاں تو ”زرمی طلبہ سخن درین است“ والا مسئلہ تھا۔ اس لیے وہ خود کو عاشق صادق اور دوسروں کو رقیبانِ روسیہ سمجھنے میں حق بجانب تھے۔ کچھ ان رقابتوں سے عشق میں گرمی اور چاشنی بھی پیدا ہوتی تھی اس لیے ان کی شاعری میں جو نیور ہیں، رشک و رقابت کے جذبات اور لب و لہجہ میں طنز و تعریض کی آمیزش ہے وہ محض برائے بیت نہیں ہے۔ ان اشعار کا اپنا ہی مفہوم ہے:

اگر رشک عدو کا ذکر ہو قاصد تو کہہ دینا
یہ صدمہ صاحبِ غیرت کے دل سے کم نکلتا ہے

غیروں سے التفات پہ ٹوکا تو یہ کہا
دنیا میں بات بھی نہ کریں کیا کسی سے ہم

تمہارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا
نہ تمہارا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا؟

رقیب سے کسی بات پر آزرہ ہو کر حجاب داغ کے پاس آگئیں اور رخصت ہوتے وقت ان سے کلکتہ آنے کا وعدہ لے گئیں۔ وہاں کلکتہ میں بھی رقیبانِ روسیہ کی پوری ایک پلٹن تھی اس نے حجاب کو اکسایا کہ اگر وہ عاشق صادق ہے تو اُسے یہاں بلا کر دکھاؤ۔

کتے پانی میں ہیں ذرا دیکھو
وہ نہ آئیں گے تم بکلا دیکھو

تم نے دیکھا ہے کیا زمانے کا
داغ ہے چالیا زمانے کا

چنانچہ حجاب نے ان کو خط لکھا:

زندگی بخش نام ذوق و نظیر
رشد سودا در د و موت و میر

رسم الفت بنا ہتے ہو اگر
جان کی خیر چاہتے ہو اگر

آٹھ کے سیدھے ادھر چلے آؤ
کوئی روکے مگر چلے آؤ

ریل میں اتنی دور آنا کیا
کارِ سرکار کا بہانہ کیا

داغ کو اتنا لمبا سفر کرنے میں تامل ضرور تھا۔ ایک تو رامپور سے طویل رخصت لینا ضروری پھر مصارف سفر کا معاملہ۔ بہر حال انھوں نے اللہ کا نام لے کر ہائی بھری اور سفر کی تیاری شروع کر دی۔ پہلے رخصت لے کر دلی آئے، یہاں سے لکھنؤ کا قصد کیا اور وہاں انجم نیشاپوری کے مہمان رہے۔ لکھنؤ سے داغ عظیم آباد پٹنہ آئے یہاں ان کے اخیانی برادر آغا مرزا شاعری خاف آغا تراب علی محلہ گڑھتہ میں رہتے تھے داغ ان کے مہمان ہوئے مگر ان کا مکان مختصر سا تھا اور داغ کے پاس ملنے والوں کا اتنا بندھا رہتا تھا اس لیے بعد کو میر باقر (مستوفی) فروری ۱۹۲۶ء

کی حویلی میں منتقل ہو گئے۔ عظیم آباد میں انھوں نے متعدد طرحی مشاعروں میں شرکت کی اور اپنی دھاک بٹھادی۔ یہ مشہور غزل بیٹہ ہی میں کہی تھی جس کا مقطع ہے :

کوئی چھینا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں منتظر ساون کے بیٹھے ہیں
اس کی داد امیر مینائی نے بھی دی ہے :

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے
بھنویں تننتی ہیں خنجر باقہ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
میر باقر، وحید الہ آبادی کے شاگرد تھے اور انھوں نے اپنے استاد ہی کا مصرع طرح میں دیا تھا۔ داغ نے مثنوی ”فریاد داغ“ میں اپنا قیام بیٹہ ایک ہفتہ بتایا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے وہ اس شہر میں لگ بھگ ایک مہینے تک رہے۔ جب ساون کے چھینے پڑ گئے تو وہ کلکتہ روانہ ہوئے۔ وہاں بھی ان کا پر جوش استقبال کیا گیا۔

شہر میں دھوم تھی کہ داغ آیا
داغ آیا تو باغ باغ آیا

دیکھ کہ شہر کھل گئیں آنکھیں
ماہرویوں پہ ڈھل گئیں آنکھیں

خود بہ خود دل کھلا ہی جاتا تھا
قہقہہ لب پر آ ہی جاتا تھا

کالی کالی گھٹائیں آتی تھیں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں

اردو اکادمی، دہلی اپنی چند گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کر چکی ہے۔ انہی سرگرمیوں میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی ماہنامہ "ایوانِ اردو" اور بچوں کا ماہنامہ "امنگ" کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

پیش نظر کتاب استاد داغ دہلوی کی زندگی اور ان کے شعری کارناموں کا جامعیت کے ساتھ احاطہ کرتی ہے۔ جو مضامین اس کتاب میں شامل ہیں وہ اردو اکادمی کی طرف سے داغ پر ہونے والے سیمینار میں پڑھے گئے تھے۔ جنہیں ڈاکٹر کامل قریشی نے بڑے سلیقے سے یکجا کیا ہے۔ اردو شاعری کو داغ دہلوی کی جو دین ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ان کے بعد ان کے جانشینوں میں بھی بڑے بڑے اساتذہ کے نام ہیں جنہوں نے سینکڑوں نوآموز شعرا کی تربیت کی اور انہیں اردو زبان اور اردو شاعری کی نزاکتوں اور نفاستوں سے آشنا کیا۔ داغ کو یاد رکھنا ہمارا ادبی فریضہ ہے۔ اس کتاب کو اسی فریضے کی ادائیگی کی ایک کوشش سمجھنا چاہیے۔

ہم اردو اکادمی کے سرپرست اور صدر نشین عالی جناب صاحب سنگھ جی وزیر اعلیٰ دہلی کی عنایات اور توجہات کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں اس کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ ساتھ ہی اکادمی کی تحقیقی و اشاعتی کمیٹی کے اراکین کے بھی شکر گزار ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ زیر نظر کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرے گی اور ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

ڈاکٹر صادق

سکریٹری اردو اکادمی، دہلی

چاندنی کے تمام شب جلے
دلکش سقف پر عجب جلے

رات عیش و نشاط میں گذری
صبح تک اختلاط میں گذری

منی بانی کو لولہ اسٹریٹ پر رہتی تھی۔ داغ کے قیام کے لیے ناخدا مسجد کے سامنے ایک بالا خانہ حاصل کر لیا گیا تھا۔ غرض یہ وہاں خوب لگ بھگ اڑاتے رہے، اچانک رامپور سے طلبی ہو گئی اور ادھر ماہ رمضان بھی سر پر آ گیا تھا۔ داغ تین جولائی ۱۸۸۶ء کو کلکتہ سے روانہ ہوئے، ریل نے دو دن بعد رامپور پہنچا دیا۔ غالباً جولائی کو پہلا درزہ ہوا۔ یہ مارے باندھے آؤ گئے تھے مگر دل وہیں پھنسا ہوا تھا:

داغ آوارہ کو اے یار تے کوچے سے
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

اس کے بعد بھی حجاب رامپور آتی رہی اور عشق و وفات کا چکر چلتا رہا۔ مارچ ۱۸۸۶ء کو نواب کلب علی خاں کا انتقال ہوا تو سارے فتنے بکھر گئے۔ سب کچھ خواب و خیال ہو گیا۔ داغ نے بھی رام پور کو خیر باد کہا وہ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۶ء کو یہاں سے نکلے، اب پھر وہی فکر و فکریات سامنے تھی۔ عشق تباں کا لولہ سر د پڑ چکا تھا، دلی میں اب بھی کیا رکھا تھا، داغ نے ۱۸۸۶ء میں لاہور، امرتسر، کشن گرٹھ، اجیر، آگرہ، علی گرٹھ، سعد آباد وغیرہ کے سفر کیے اور حالات کا جائزہ لینے کو حیدر آباد بھی پہنچے مگر فوراً واپس ہو گئی۔ وہاں سے ۷ مارچ ۱۸۸۷ء کو بلاوا آیا تو دوبارہ گئے۔ ساڑھے تین سال تک امیرداری میں پڑے رہے پھر ساڑھے چار سو باہوار پر مستقل ہوئے اور انھیں ساڑھے تین سال کا بقایا مشاہرہ یکمشت مل گیا۔ مزید تین برس کے بعد تنخواہ ایک ہزار ہو گئی اور یہ بھی اول دن سے شمار کی گئی، بقایا تنخواہ کا حساب ۴۰-۴۱ ہزار روپیہ بنتا تھا وہ سب روپیہ بندویں میں لاد کر داغ کے گھر پہنچایا گیا۔ کام صرف یہ کہ استاد شاہ تھے۔ نواب میر محبوب علی خاں نے ان کی قدر افزائی میں کوئی کمی

نہیں کی۔ ”بلبل ہند جہاں استاد نواب فصیح الملک دبیر الدولہ ناظم یار جنگ“ خطابات مرحمت ہوئے اور جاگیر میں ایک گانو بھی ملا۔ داغ محلہ محبوب گنج میں رہتے تھے، سیر و شکار میں اعلیٰ حضرت کے ساتھ ہوتے تھے ایک بار ان کے رکاب میں کلکتہ بھی گئے اس وقت کوئی تھے صاحب مئی بانی حجاب کو پردہ نشین بنا چکے تھے۔ داغ کے آنے کی دھوم مچی ہوگی تو حجاب نے سوچا ہوگا کہ اس کو دفتر میں وہ بھی شریک بن سکتی ہے۔ یہ سفر دسمبر ۱۸۹۹ء میں ہوا تھا۔ اب حجاب نے جسے صاحب کو دھتا بتایا اور ان سے طلاق لے کر حیدر آباد جانے کی ٹھانی۔ داغ اب سترے بہترے ہو چکے تھے، نہ منہ میں دانت تھے نہ پیٹ میں آنت، مگر بقول اکبر الہ آبادی:

شیخ صاحب کی کمر جھک گئی اور دل نہ جھکا
آج تک شوق سفقور چلا جاتا ہے

جوانی کی وہ رنگین راتیں، وہ گھاتیں اور ملاقاتیں، وہ رنگ رلیاں اور نرم آرائیاں اب ایک میٹھا درد بن کر دل میں بس چکی تھیں، داغ خود کو کبھی یہی دھوکہ دیتے تھے کہ وہ حجاب سے عشق کرتے ہیں اور وہ بھی سچ سچ والا۔ مگر دراصل پرانی بیٹی ہوئی راتوں کی کسک تھی جو دل میں چٹکیاں لیتی تھی، جب وہ جوان تھے تو اتنے اسباب فراہم نہ تھے اب دولت دنیا کی ریل سپل ہوئی تو یہ دیکھتے بھر کے باقی رہ گئے تھے، ایک اور جیلہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۲ء میں ان کی اہلیہ بھی انتقال کر گئیں۔ اگرچہ داغ کی زندگی میں اس اللہ بندی کا کوئی ایسا مقام نہ تھا لیکن بڑھاپے میں تنہائی کا احساس اور بھی تیز ہو گیا ہوگا۔ ادھر سے حجاب نے حیدر آباد آنے پر رضامندی ظاہر کی، ادھر یہ اس کا تذکرہ کر کے خوش ہوتے رہے اور اس کی آمد کے دن گفنے لگے اور بڑھاپے میں بھی اسے عاشقانہ خطوط لکھتے تھے۔ ۱۹۱۷ء کے اواخر یا ۱۹۱۸ء کے آغاز میں حجاب آئی مگر بڑے نخر وں کے ساتھ۔ اس زمانے میں کسی نے داغ سے پوچھا کہ آخراں آپ کیوں حجاب سے نکاح کرنے پر تیلے ہوئے ہیں۔ آپ کی بیٹی مصنوعی ہے داڑھی اور سر کے بال مہندی سے رنگے جاتے ہیں، تو مرزا صاحب

نے فرمایا کہ میں حجاب کو اپنی بیوی نہیں بناؤں گا بلکہ رفیق بناؤں گا۔ مجھے اپنی کبر سنی کا احساس ہے منہ میں بجائے قدرتی دانتوں کے ستیسی بھی مجھے محسوس ہوتی ہے، دسمہ اور تہدی بھی ہفتہ میں دوبار لگتی ہے، میری مسہری بھی ایک نو عروس کی مسہری معلوم ہوتی ہے رنگین جالی کے پردے جن پر گونا اور ٹھپٹا لگا ہوا ہے، انگوری سیل کی جھال بھی لہرا رہی ہے تو پھر جب یہ سب باتیں روائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مٹی بائی حجاب میرے لیے جائز نہ کر دی جائے۔
(روزنامہ چمچ ۶ فروری ۱۹۵۲ء)

اس سے پہلے ایک بزم بے تکلف میں داغ نے اپنے حاضر باش دوستوں سے پوچھا تھا کیا حسے صاحب سے طلاق لینے کے بعد مٹی بائی کو عدت میں بیٹھنا ہوگا؟ لوگوں نے کہا کیوں نہیں۔ بولے دس برس میں بھر ڈولے سے کچھ نہ ہوا تو عین طلاق کے زمانے میں اُس سے کیا ہو سکا ہوگا۔ بھائی مجھ سے تو یہ نہ ہوگا کہ میں انھیں عدت میں بیٹھاؤں، میرے نزدیک ۲۲ برس سے وہ عدت میں بیٹھی رہیں، آخر کب تک عدت میں رہیں گی؟ ۲۵ دسمبر ۱۹۵۱ء)

حجاب کلکتہ میں بھتیں تو داغ لکھتے تھے: ”بائی جی غضب تو یہ ہے کہ دور بیٹھی ہو، پاس ہوتیں تو سیر ہوتی، تمہارے گرد گھومتا اور شعلہ جوالہ بن جاتا کبھی تمھیں شمع قرار دیتا اور پنتنگا بن کر قربان ہو سو جاتا، کبھی بلائیں لیتا اور کبھی صدقے ہو جاتا۔“

اب جو حجاب حیدر آباد پہنچیں تو معلوم ہوا کہ صوم و صلاۃ کی بڑی پابند ہیں۔ رجب سے روزہ رکھنا شروع کر دیتی ہیں اور یہ سلسلہ رمضان کے آخر تک چلتا ہے، اور روزہ و طائف سے بھی شغف بڑھ گیا ہے۔ داغ نے ان کے آنے سے پہلے ہی ایک تسبیح اور جانماز منگا کر رکھ لی تھی اور کہا تھا کہ وہ یہاں آئیں تو سب سے پہلے ان کو یہی تحفہ پیش کیا جائے۔ ایک خطا جھوٹ نے اُس وقت حجاب کو دیکھا تھا اُن کا حلیہ یوں بیان کرتے ہیں: ”کوئی ۴۰-۵۰ سال کا سن ہوگا۔ رنگ صاف، آنکھیں بڑی بڑی، ناک اونچی، بالوں پر خضاب چڑھا ہوا پتلے پتلے لب، مہیانہ قد، اونچی پیشانی، مانگ بھٹی بھٹی، تنگ اطلس کا پاجامہ، مغزی لٹکا ہوا لانا کرنا اور اُس پر سفید اور مٹی، پاؤں میں دہلی کی جوتی اور دونوں ہاتھوں کی پستی پستی انگلیوں میں انگوٹھیاں۔“ (دلیپن علی خاں، نگار۔ جنوری ۱۹۵۳ء)

داغ اور حجاب کی محبت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کو داغ نے ایک محبت نامہ بھیجا: ”دشمن جانی، سلام شوق۔ عین انتظار میں تھا را محبت نامہ دستیاب ہوا۔ کئی بار پڑھا اور آنکھوں سے لگایا چوما اور چھاتی پر دھرا۔ تم لکھتی ہو مجھے بھول جاؤ اور اگر نہ بھولو تو بدل جاؤ، یہ کر لو گے جیسی تمہارے پاس آؤں گی۔ خوب، تم کو میں بھول جاؤں۔“

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ

نادان کس طرح تجھے دل سے بھلاؤں ہم

اچھا تم یہاں آ جاؤ پھر ہم ایک دوسرے کو بھولنے کی کوشش کریں گے۔“

ابھی یہ خط کلکتہ پہنچا بھی نہ ہو گا کہ داغ کے شاگرد نوح ناروی تشریف لائے اور انھوں نے استاد کی خدمت میں الہ آباد کی ایک طوائف نبی جان کی تصویر بطور رہ آور پیش کی۔ داغ اس تصویر پر موہت ہو گئے اور فوراً ایک محبت نامہ دھر گھسیٹا (انشائے داغ ص ۶۶)۔ ”کیوں جی تم سے کیوں کر ملیں، تم کو کیوں کر دیکھیں کیوں کر سنیں اور نہ دیکھیں تو کیوں کر

جیئیں۔“ (۱۵ دسمبر ۱۹۱۷ء)

حجاب ادھر سے اسی امید پر آرہی تھیں کہ نواب مرزا داغ سے نکاح کر کے بیٹھیں گی۔ آنے سے پہلے ہی انھوں نے داغ کو نوٹس دے دیا تھا کہ ”جب تک نکاح نہیں کر لوں گی تمہارے سامنے نہیں آؤں گی۔ میں نے یہ تمام جھگڑے اس لیے نہیں کیے کہ شرعی باتوں کی خلاف ورزی کروں تم اس بھر دے میں نہ رہنا کہ میں تمہارے سامنے آؤں۔“

۱۸ یا ۱۹ جنوری ۱۹۱۷ء کو حجاب حیدر آباد پہنچی۔ اس سے داغ کی آخری ملاقات ۳ جولائی ۱۹۱۷ء کو ہوئی تھی، اب ساڑھے ۱۹ سال کے بعد وہ آئی ہے تو روزنامہ نگار لکھتا ہے: ”ایک طوائف کی ایسی دنیا بدلی ہے کہ کوئی وقت و طیف سے خالی نہیں ہے۔۔۔۔۔“

مرزا صاحب فرما رہے تھے کہ دو چار برس میں ولیہ ہو جائیں گی۔“ (۲۲ جنوری ۱۹۱۷ء) داغ نے جاننا زور تسبیح بھجوائی تو یہ بھی کہلا بھیجا کہ جب تک تمہارے و طیف و طاقت نہیں چھوٹیں گے۔ اس وقت تک تم انسان نہیں بن سکتیں اور جب تک انسان نہ بن سکیں اس وقت تک میرے کام کی نہیں ہو سکتیں۔“

شروع میں تو یہ شورشوری رہی کہ دو تین گھنٹے کے سوا باقی سارا وقت حجاب کے پاس گذرتا تھا۔ روز کے حاضر باش احباب بُرا ماننے لگے اور بعض نے آنا ہی کم کر دیا۔ پھر بعض دوستوں سے پردہ چھوٹ گیا اور اب شطرنج کی بازیاں یا پتنگ کے پیچ ہونے لگے، دآغ نے حجاب کو سو روپے ماہوار دینا شروع کیا تھا مگر وہ ناکافی ہونے لگا اور حجاب نے قرض وام لینا شروع کر دیا جسے کچھ دنوں تک دآغ بھگتاتے رہے۔ پھر حجاب نے کلکتہ سے اپنے باقی کٹمب کو بھی بلا لیا اس سے روزمرہ کے اخراجات اور سوا ہو گئے۔ اسے بھی پھیل لیتے مگر دآغ کے مستقل اور تنخواہ دار مصاحبوں میں ایک آدھ مغیبت بھی ضرور رہتی تھی۔ اس زمانے میں سورت کی کوئی اختر جان تھیں جن کی صورت سے دآغ دل بہلا لیا کرتے تھے۔ حجاب نے دآغ کی ڈیوڑھی میں جرمیلی حکم نافذ کر دیا اور ان کے رنگ میں بھنگ ڈالنے لگیں تو دآغ کو اندازہ ہوا کہ بڑھاپے کا عشق کتنا ہنگامتا ہے۔ دو چار مہینے تو عدت کے بہانے سے کٹ گئے اب نکاح کا تقاضا شروع ہوا۔ دآغ نے ایک دن اپنے احباب سے کہا: ”کچھ سنا؟ نکاح کا تقاضا ہو رہا ہے۔ بڑھے ہو گئے، منہ میں دانت نہیں پیٹ میں آنت نہیں، نکاح کا حاصل اور جزو اعظم دونوں کے پاس ندارد۔“

اب دوستوں سے فریاد کرتے تھے اور انھیں بیچ میں ڈال کر سمجھوتا کرنے کی درخواست ہوتی تھی۔ یہ گویا شنوی فریاد دآغ کا دوسرا بھاگ تھا۔ خلاصہ یہ کہ حجاب مایوس ہو کر کلکتہ واپس ہو گئی۔ دآغ اُسے وہاں بھی کچھ فتوح بھیجتے رہے۔ ایک دآغ وہ تھے جو شنوی فریاد دآغ میں کہتے ہیں:

گر چہ مل جائے ہسراں ایسا
نہ ملے گا مزاجداں ایسا

یا الہی نجات غم سے ملے
وہ سراپا حجاب ہم سے ملے

ورنہ اس کا خیال بھی نہ رہے
 اب ہے جیسا یہ حال بھی نہ رہے
 اور جب ان کی یہ دعا قبول ہو گئی تو تنگ آکر کہنے لگے:
 الہی تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا
 کچھ ان کی ذات سے دنیا کا انتظام نہیں

غرض دو گونہ عذاب است جان مجنوں را
 بلاے فرقتِ لیلیٰ و صحبتِ لیلیٰ

ایک دو سال بعد ہی ۱۷ فروری ۱۹۵۹ء ۹ ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ کو ۷۶ سال کی عمر میں اردو کے اس بے مثال شاعر نے بھی اس دنیا سے حجاب کر لیا۔ مکہ مسجد حیدر آباد میں ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی گئی اور درگاہ حضرت یوسف شریعت نامپلی میں اپنی اہلیہ کی قبر کے پاس دفن کر دیے گئے۔ داغ کی حیاتِ معاشقہ پر اس نظر سے گفتگو ابھی باقی رہ گئی کہ یہ اُن کی عاشقانہ اور بقول حسرت موہانی فاسقانہ شاعری کا پورا پس منظر پیش کرتی ہے اور اس کا گہرا مطالعہ کرنے سے ہی ان کے لبِ دلہجہ کی شوخی اور معاملہ بندی کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ دروغِ برگردن راوی مگر یہ لطیفہ مشہور ہے کہ ایک بار امیر مینائی نے داغ سے کہا کہ ہم تم ایک ہی زمین میں غزل لکھتے ہیں، ایک ہی زبان ہے، ایک سے قوافی ہیں، ایک سے مضامین ہیں پھر یہ کیا بات ہے کہ تمھاری غزل میں جو چٹخار ہے وہ ہماری غزل میں نہیں آتا۔ داغ نے کہا مولانا کیا آپ نے کبھی کسی طوائف سے عشق فرمایا ہے؟ امیر نے کہا: لا حول ولا قوۃ۔ داغ بولے بس تو جوڑو کا عاشق ایسی ہی غزل کہہ سکتا ہے جیسی آپ کہتے ہیں۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

دآغ کا نظریہ فن

مولانا احسن مارہروی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ رام پور میں میٹر شکوہ آبادی نے سر دربار دآغ کا دامن تمام لیا اور سوال کیا کہ آپ کے اشعار زبان سے نکلتے ہی زبان زدِ خاص و عام ہو جاتے ہیں اور میں خونِ جگر صرف کر کے شعر کہتا ہوں مگر لوگ متوجہ نہیں ہوتے۔ دآغ ابھی کوئی جواب نہیں دے پائے تھے کہ امیر مینائی بول اُٹھے کہ یہ خدا داد مقبولیت ہے۔ اس پر کسی کا بس نہیں چل سکتا۔

یہ واقعہ بظاہر معمولی معلوم ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ کوئی یہ کہے کہ اساتذہ جب اپنے ہم عصروں کی تعریف کرتے تھے تو اس میں ان کا اپنا انکسار بھی شامل ہوتا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس انکسار میں ایک اعتراف بھی پوشیدہ ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ عہدِ دآغ میں میٹر۔ امیر۔ جلال اور تسلیم جیسے یکتائے فن اساتذہ موجود ہیں مگر سکے دآغ کا چل رہا ہے۔ قلعہ معلیٰ سے تعلق اور ذوق کی شاگردی نے دآغ کے کلام میں زبانِ دانی کے جوہر پیدا کیے مگر ان حسب سے زیادہ ان کے امام فن ہونے میں

خود اُن کے شاعرانہ بانئین اور شوخی بیان کو دخل ہے۔ ان کے یہاں فکر کی گہرائی نہ سہی مگر فن کے وہ نمونے اور لب و لہجہ کا وہ تیکھا پن موجود ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا۔

اب کہاں وہ بانئین، وہ شوخی طرزیں
اُگ تھی کا فور سپیری میں جوانی کی نہاں

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیٹی معنی وہاں بے پردہ، یاں محل میں ہے

مہو ہو کھینچنے کا لیکن عشق کی تصویر کون
اُٹھ گیا ناوکِ فغن، مارے گا دل پر تیر کون

داغ ہماری ادبی تہذیب کا آخری نمائندہ تھا۔ اس کے بعد جو شعرا سامنے آتے ہیں اُن کے یہاں وہ رچا ہوا انداز اور ارضی خوبو کم نظر آتی ہے جو داغ کی شاعری کا طغرائے امتیاز ہے۔ اُن کے فکر و فن کا تجزیہ کرنے سے پہلے اس پس منظر کا مطالعہ ضروری ہے جس میں داغ کے ذہن کی نشو و نما ہوئی۔ داغ ذوق کے شاگرد ہیں۔ استاد کے کمالات فن کا اظہار محاوروں کے چٹخاروں، الفاظ کے پینتروں اور برجستہ جملوں اور فقروں میں نمایاں ہے۔ شاگرد کو بھی یہ زمین دلچسپ اور رنگین معلوم ہوئی۔ قلعہ معلیٰ کی پرورش نے رنگینیوں اور عیش و عشرت سے آشنا کیا۔ غالب و مومن کے فکر کی روایت تو نہ اپنا سکے البتہ اُن کے جمالیاتی احساس کو اپنی زندگی اور شاعری کا حصہ بنا لیا۔ جب رام پور آئے تو قلعہ معلیٰ کی کمی کو دربارِ رام پور نے پورا کر دیا۔ رنگ رلیاں، عیش و عشرت، طوا لقاؤں کے بحر، سازندوں کے نغمے یہ سب زوالِ آمادہ تہذیب کی کہانیاں سنار ہی تھیں۔ ایسے زوالِ آمادہ دور میں جب قوم منزل کی طرف چلتے چلتے تھک جاتی ہے اور کسی درخت کے سایہ میں آرام کرتی ہے تو وہ فکر کی منزل سے بہت دور رہ جاتی ہے

اور صرف فن کے سینترے اور زبان دانی کا فن باقی رہ جاتا ہے۔ اس لیے اگر داغ نے اس میدان شعر و ادب میں فکر کی جگہ فن کا موضوع کے مقابلے میں ہدیت کا فلسفیانہ انداز فکر کی جگہ زبان دانی کا انتخاب کیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ صرف دیکھنا یہ ہے کہ جس میدان کو انھوں نے اپنا یا اس کا حق ادا کر سکے یا نہیں؟ نیز انھوں نے فن کے جو معیار دوسروں کے لیے قائم کیے اس پر خود بھی عمل پیرا ہوئے؟ اس سوال کے جواب کے لیے ہم داغ کی دوسری اصنافِ سخن کو سر دست نظر انداز کرتے ہیں اور اپنے مطالعہ کو ان کی غزل تک محدود رکھتے ہیں۔

غزل ایک داخلی صنفِ سخن ہے جس کی بنیاد تخیل اور جذبہ کے امتزاج سے قائم ہے۔ ان دونوں میں سے کسی کا توازن بگڑ جائے تو پوری غزل کی عبارت نیچے آجائے گی۔ اسی عدم توازن کے باعث ہمارے بہت سے ممتاز شاعر رسوا ہو گئے۔ تخیل کی بے راہ روی معنی تو حل کر سکتی ہے مگر اچھے شعر کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ جذبہ سے عاری شاعر محض موزونی طبع کا مظاہرہ کر سکتا ہے مگر اعلیٰ شاعری کا نمونہ پیش نہیں کر سکتا۔ ان دونوں کے امتزاج سے جمالیاتی حسن پیدا ہوتا ہے۔ بقول یوسف حسین خاں ”یہ تخیل کا بے لوث عمل ہے جو خود اپنا مقصد ہوتا ہے۔“ یہی سبب ہے کہ اگر داغ کے فن کا تجزیہ کیا جائے تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ان کی شاعری جس خمیر سے گوندھی گئی ہے اس کے عناصر ترکیبی میں تخیل کا بانگین، جذبہ کی شدت، زبان و بیان کے چٹارے، لب و لہجہ کا تیکھا پن، کبھی پھبتی اور کبھی چٹکی، کبھی مسکراہٹ زیر لب اور کبھی قہقہہ۔ ان کے یہاں عشق کی رنگینی بھی ہے اور زندانہ شوخی بھی مگر ان سب میں ہر لفظ ہر جملے پر نظر ہے کہ کہیں ٹکسال باہر تو نہیں ہو گیا۔ داغ نے اپنے محبوب کے لیے کہا تھا مگر ان کے نظریہ فن پر بھی یہ لباس کس قدر پورا اترتا ہے۔

بھر دیں عجب ادائیں اس شوخِ سیم تن میں
اک ٹیڑھ سادگی میں، اک سیدھ بانگین میں
مطلب کی چھیڑاں سے پنہاں سخنِ سخن میں
سچ ہے کہ داغ پر فن یکتا ہے اپنے فن میں

داغ نے فن کے جس نظریہ کو دوسروں کے لیے قائم کیا اس پر پہلے خود عمل کیا۔ اُن کا نقطہ نظر صرف یہ تھا کہ زبان و بیان میں ندرت ہو اور کوئی بات بغیر محاورہ نہ ہو۔ چنانچہ اپنے ایک شاگرد سید ابوالحسن ناطق گلاؤٹھی کو لکھے ہیں۔

”یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ ہر شعر میں کسی محاورے کا استعمال کرتے ہیں۔ اور بیشتر کامیابی کے ساتھ مگر اس کا لحاظ رکھئے کہ شعر کے لیے محاورہ آجائے، محاورے کے لیے شعر میں سقم نہ آئے پائے اور یہ بھی خیال رہے کہ اس میں تصرف جائز نہیں۔ اگر آسانی کے ساتھ محاورہ بجنسہ بحر میں آجائے تو نظم کر دیجئے ورنہ نہیں!“

اس ایک اقتباس سے دو نتیجے نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ داغ محاورے کے استعمال کو نہ صرف پسند کرتے تھے بلکہ اچھے شعر کے لیے اس کو ضروری بھی خیال کرتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ محاورہ میں کسی قسم کے تصرف کی اجازت نہیں دیتے۔ داغ کے دوسرے فتوے سے دورِ جدید کے اُن تمام شاعروں کا اجتہاد مسترد ہو جاتا ہے جو لفظ، محاورہ اور ترکیب میں تصرف کر کے کہتے ہیں کہ ”میں اس کو جائز سمجھتا ہوں“ داغ نے دعویٰ کیا اس کی تائید اُن کے کلام سے ہو جاتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں
آپ کے ملنے کا ہو گا جسے ارمان ہو گا

یہ کیا کہا کہ میسری بلا بھی نہ آئے گی
کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی

ہر ادا مستاد سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُت تری کا فر جوانی جوش پر آئی ہوئی

لے انشاء داغ۔ مرتبہ احسن مارہروی

ڈاکٹر کامل قریشی

مقدمہ

جہاں استاد، ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، بیل ہندوستان، فصیح الملک مرزا خاں داغ دہلوی وہ برگزیدہ، عالی مقام اور عظیم المرتبت شاعر و فنکار ہیں جو اپنے فکر و فن، شعر و سخن اور زبان و ادب کی تاریخی خدمات کے سبب اپنی بھرپور شاعرانہ عظمت اور شان و شوکت کے ساتھ اردو کے افق شاعری کی معراج کمال پر جلوہ گر نظر آتے ہیں وہ دہلوی روایات کے بے مثل امین، دلی کے زبان و بیان کے عظیم نمائندے مخصوص رنگ و آہنگ کے منفرد ترجمان، دبستانِ دلی کی خصوصیات کے بڑے علمبردار اور اپنے خاص طرزِ ادا کے اعتبار سے ایک بے بدل فنکار ہیں اپنی گوناگوں صلاحیتوں اور فنکارانہ محاسن کی وجہ سے ان کی شخصیت ایک جامع الصفات حیثیت کی مالک ہے۔

بیل ہندوستان کے طور پر ان کی اُدا رتے ۱۸ ویں صدی عیسوی میں ملک کی فضاؤں کو مسحور کیا، فصیح الملک کی صورت میں انھوں نے زبان کے وہ دریا بہائے کہ جن سے دنیا اُردو آج تک سیراب ہو رہی ہے ان کی شاعری کے سحر نے وہ جادو جگائے ہیں کہ جہاں علم و ادب نے ان کے فن کا لوہا مانا اور انھیں جہاں استاد، تسلیم کیا۔

تھی نہ تاب ستم تو حضرت دل
عاشقی کو سلام کرنا تھا

غیر کی محفل میں مجھ کو مثل شمع
آٹھ آٹھ آنسو رلایا آپ نے

اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ محاورے کے شوق میں بعض اوقات وہ شعر کے
مزاج کو بھی فراموش کر دیتے ہیں۔ مثلاً ان کے یہ اشعار سنئے۔

تو بھی اے ناصح کسی پر جان دے
ہاتھ لا اُستاد کیوں کیسی کہی

کیوں تجھے چُپ لگی ہے اے قاصد
منہ سے تو بھڑٹ کچھ کہا بھی ہے

آئے چکر میں جناب زاہد
دختر رز کا پیر بھاری ہے

مگر اس قسم کے اشعار داغ کا مزاج نہیں تھے۔ ان کے یہاں بیان کی شوخی تو اکثر
سرحد کو پار کر گئی ہے مگر محاورے اور الفاظ کا خون نہیں ہونے دیا ہے۔

زبان کے سلسلے میں داغ کا نقطہ نظر محتاط بھی تھا اور لفظ کے غلط استعمال
پر برملا ٹوک بھی دیتے تھے۔ انھوں نے جس زبان کو سند خیال کیا تھا وہ دہلی کی زبان
تھی۔ لکھنؤ کی زبان کو اگر مسترد نہیں کرتے تو اس کو قابلِ تقلید بھی نہیں سمجھتے۔

مستند اہل زبان، خاص ہیں دہلی والے
اس میں غیروں کا تصرف نہیں مانا جاتا

نثار علی شہرت نے داغ کی ایک گفتگو کا حوالہ دیا ہے۔

”فرمانے لگے کہ جس طرح کان میں سے جو اہر نکلتے ہیں اسی طرح قلعہ معلیٰ اور دہلی سے اردو زبان نکلی ہے۔ جس کے محاورے لال ویا قوت کو پرے بٹھاتے ہیں۔ پس کوشش یہ ہے کہ دہلی کی شستہ و رفتہ زبان تمام ہندوستان میں پھیل جاوے اور ہر شہر میں ایسی ہی اردو زبان بولی جاوے جیسی کہ دہلی میں بولی جاتی ہے۔“

لفظ طرز کے مونث اور مذکر کے بارے میں بحث تھی۔ داغ نے اس کو مونث قرار دیا ہے۔ اس خط میں بھی اہل لکھنؤ کے فیصلے سے اپنی برأت کا اظہار کرتے ہیں۔

”یہ لکھنؤ والوں نے اصلاح دے کر چھاپا ہو گا۔ میں نے جو اس وقت ’آفتاب داغ‘ دیکھا تو اُس میں ’طرز‘ اپنی ہے جدا، لکھا ہے۔ ’طرز‘ مونث ہے۔ ہرگز مذکر نہیں ہے۔“

ٹوپی اور ہنایا ٹوپی پہننا کی بحث میں داغ نے ٹوپی پہننے کو درست قرار دیا ہے۔ اسی طرح کسی شاگرد نے استاد کے پاس غزل اصلاح کے لیے بھیجی جن کا شعر تھا۔

غیر کو دیکھتا ہے وہ ظالم
کس سے آنکھیں دو چار کرتا ہے

استاد نے اس پر لکھ دیا کہ محاورہ آنکھیں چار کرنا ہے۔ اہل دہلی دو چار کرنا نہیں بولتے۔ اس لیے دوسرے مصرعہ کو بدل دیا کہ ’کس سے آنکھیں وہ چار کرتا ہے‘ ایک خط میں مولانا احسن مارہروی کو لکھتے ہیں ”کسی شخص نے لفظ ’ایجاد‘ اور ’ارشاد‘ کو مونث یا مذکر ہے حالانکہ اہل دہلی کی زبان پر دونوں لفظ مذکر ہیں۔ اسی طرح اصناف کو ناگزیر تو سمجھتے ہیں مگر اس کی زیادتی کو شعر کا عیب خیال کرتے ہیں۔“

ہے اصناف بھی ضروری مگر ایسی تو نہ ہو
ایک مصرع میں جو ہو چار جگہ بلکہ سوا

لہ، لہ، آئینہ داغ، بحوالہ مطالعہ داغ

لہ زبان داغ

ان کے نزدیک ایک شعر کا معیار یہ ہے۔

اصطلاح اچھی، مثل اچھی ہو، بندش اچھی
روزمرہ بھی رہے صاف فصاحت سے بھرا

کہتے ہیں اسے زبان اُردو

جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

زبان کی تعمیر میں داغ نے جو رول ادا کیا ہے اس نے اُردو شاعری کے مستقبل کے رُخ کو بدل دیا۔ اساتذہ متقدمین کا درجہ یقیناً داغ سے بڑا ہے مگر زبان کو قدامت پرستی سے آزاد کر کے اس کو نیا نکھار داغ نے عطا کیا ہے۔ غالب، مومن اور ذوق ان سب کا فکر اور تخیل میں داغ سے درجہ بلند ہے۔ لیکن زبان کی اصلاح اور اس کو زیادہ شستہ بنانے میں داغ اُن سے آگے ہیں۔

داغ بنیادی طور پر جمالیات کے شاعر ہیں مگر اُن کے جمالیاتی نقطہ نظر کو سمجھنے سے پہلے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس عہد کی نثر و نظم دو مختلف ذہنی رویوں کی آئینہ دار ہے۔ ایک طرف وہ مقصدیت ہے جو جمالیاتی قدروں سے بے نیاز ہو کر اپنے مقصد کے اظہار کو حرفِ آخر خیال کر رہی ہے دوسری طرف وہ جمال پرستی کا رجحان ہے جو ظاہری حسن اور دل کشی کو ادب کی جمالیاتی قدر مان کر مقصد سے غریزہ کر رہا ہے۔ اس کشمکش میں اول الذکر کی نمائندگی سرسید تحریک کر رہی ہے اور دوسرے کی رہنمائی داغ کے سپرد ہے۔ داغ اسکول کا اس بڑھتے ہوئے سیلاب کے درمیان قدم جما لینا ہی بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس کا اثر ان کے بعد کے شعراء پر یہ پڑا کہ خود سرسید تحریک سے متاثر ہونے والے ادیب و شاعر سپاٹ پن اور بے رنگی سے بچ گئے۔ یہ لوگ داغ اور اُن کے تلامذہ کو اپنے نزدیک نہ لاسکے مگر داغ کے جمالیاتی نقطہ نظر سے اخلاقیات بھی اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس جمالیاتی تصور کا اظہار داغ کے یہاں کبھی تشبیہات، استعارات کی صورت میں کبھی تمثیل، تراکیب اور محاوروں کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ بغیر تشریح کے

یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

شب وصل ایسی کھلی چاندنی
وہ گھبرا کے بوئے سحر ہو گئی

کہاں کہاں دل مشتاق دیدنے یہ کہا
وہ چکی برق تھجی، وہ کوہ طور آیا

اک حرفِ آرزو پہ وہ مجھ سے خفا ہوئے
اتنی سی بات کہہ کے گنہ گار ہو گیا

غضب کیا ترے وعدہ پر اعتبار کیا
تأملات قیامت کا انتظار کیا
بھلا بھلا کے جتایا ہے ان کو رازِ نہاں
چھپا چھپا کے محبت کو آشکار کیا

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

منزل عشق نہیں ہے یہ سرائے فانی
رات کی رات بٹھر جائیں بٹھرنے والے

جمالیاتی احساس اور اس کا اظہارِ داغ کی زندگی میں بھی ملتا ہے اور ان کے
کلام سے بھی نمایاں ہے۔ مولانا احسن مارہروی نے بخود دھلوی کے حوالہ سے لکھا ہے
کہ ایک مرتبہ ان سے کہنے لگے کہ ”بخود! یار ہماری طبیعت تو گند ہوئی جا رہی ہے“

میں نے کہا استاد کیا فرما رہے ہیں۔ آپ کی طبیعت اور گنبد۔ یہ تو خجریاں اور تیغ اُڈا ہے اس کو زنگ اور کثافت سے کیا کام۔ بولے تو تو جانتا ہے کہ حسینوں کو دیکھتا ہوں اور خوبصورت شعر کہتا ہوں۔ یہ ٹھہرا کیمپ کا معاملہ یہاں پر یوں کے پر جلتے ہیں۔ داغ کے یہاں خوبصورت شعر کا تصور رنگینی بیان سے بھی وابستہ ہے اور سادگی سے بھی۔ فراق لکھتے ہیں۔

”دلی کی بولی ٹھولی اپنی پوری موج زنی کے ساتھ داغ کی غزلوں میں لہرا رہی ہے۔ داغ کے لیے رائے عامہ بالکل سچائی پر کھتی کر یہ شخص زبان کا لاثانی جادوگر ہے۔ اردو شاعری نے داغ کے یرابر کا فقرہ باز آج تک پیدا کیا ہے اور نہ آئندہ پیدا کر سکے گی۔“

دیر ہو جائے بلا سے اُنھیں آرائش میں
رہ نہ جائے کسی کم بخت کا ارماں کوئی

ٹھہر گئے وہ وہاں سرو باغ تھے گویا
اگر چلے تو نسیم بہار ہو کے چلے

کچھ تعلق تو رہے، شکوہ بے جا ہی سہی
نہ کیا تم نے گلا اس کا گلا کرتے ہیں

داغ کی شاعری صرف ایک محور پر گردش کرتی ہے اور وہ ہے عشق، جنسی محبت کے باوجود اُنھوں نے عاشقانہ جذبات کا بھرم رکھا ہے اس وصف میں وہ مومن سے قریب ہیں۔ مومن کی طرح اُن کے یہاں بھی نفسیاتی بصیرت کا اظہار جگہ جگہ ملتا ہے۔

تم کو چاہا تو خطا کیا ہے بتا دو مجھ کو
دوسرا کوئی تو اپنا سادکھا دو مجھ کو

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اُدھر پروانہ آتا ہے

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمہارا کیا ہے
آنکھ نرگس کی، دہن غنچے کا، حیرت میری

فسانہ شب غم ان کو اک کہانی تھی
کچھ اعتبار کیا، کچھ نہ اعتبار کیا
گذشتہ سطور میں جس سادگی کا ذکر کیا گیا۔ اس سلسلہ میں نثار علی شہرت نے
ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ میں نے غالب سے دریافت کیا کہ ”داغ کی اردو کیسی
ہے؟“ فرمانے لگے ”ایسی عمدہ ہے کہ کسی کی کیا ہوگی۔ ذوق نے اردو کو اپنی گود میں پالا
تھا۔ داغ اس کو نہ صرف پال رہا ہے بلکہ اس کو تعلیم دے رہا ہے۔“ اس وصف کا احساس داغ کو بھی تھا۔
داغ ہی کے دم سے تھا لطف سخن
خوش بیانی کا مزا جاتا رہا

نہیں ملتا کسی مضمون میں ہمارا مضمون
طرز اپنی ہی جیسا سب سے جدار کہتے ہیں
ان کے دعوے کی تائید ان کے ان اشعار سے ملے گی جن میں سادگی کے بے ساختہ پن
نے پُرکاری پیدا کر دی ہے۔

مے مجھ سے تو فرمایا تمہیں کو داغ کہتے ہیں
تمہیں ہوا ماہ کامل میں تمہیں رہتے ہولائے میں

قیامت ہیں باتی ادائیں تمھاری
ادھر آوے لوں بلائیں تمھاری

تم کو آشفۂ مزاجوں کی خیر سے کیا کام
تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسٹو اپنے

ادھر آئینہ ہے، ادھر دل ہے
جس کو چاہا اٹھا کے دیکھ لیا

وفا کریں گے، نباہیں گے، بات مانیں گے
تمھیں بھی یاد ہے، کچھ، یہ کلام کس کا تھا

شکل یوسف کی جو تعریف، سنی، فرمایا
منصفی شرط ہے، دیکھو ادھر ایسی تو نہ تھی

داغ کے نظریۂ فن کا ایک بڑا اظہار وہ املاہیں بھی ہیں جو انھوں نے اپنے
تلامذہ کے کلام پر دی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

آصف: چہرے سے ان کے رنگ جڑ پیکا عتاب کا

کیا ہو چلا ہے رنگ گلابی نقاب کا

اصلاح: چھپتا نہیں چھپائے سے چہرہ عتاب کا

ہوتا چلا ہے رنگ گلابی نقاب کا

عزیز یار جنگ: کیا جانیں آب تیغ کی لذت جناب خضر

نازاں ہیں وہ تو اپنے ہی آب حیات پر

۱۔ یہ اصلاہیں نگار کے داغ نمبر میں یاسین علی خاں کے مضمون سے اخذ کی ہیں۔

اصلاح: کیا جانیں آبِ تیغ کی لذت جنابِ خضر
مرتے ہیں وہ تو چشمہٴ آبِ حیات پر

میر حسن امیر: بن ٹھن کے جو نکلے ہیں ابھی راہِ گذر سے
اللہ بچائے اُنھیں دشمن کی نظر سے
اصلاح: بن ٹھن کے وہ نکلے ہیں ابھی راہِ گذر سے
اللہ بچائے اُنھیں دشمن کی نظر سے

اہلِ نظر سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ اصلاح نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ان چند مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ داغ نے اصلاح میں صرف اس بات کا خیال رکھا ہے کہ الفاظ، تراکیب، روزمرہ اصول شعر کے خلاف نہ ہو۔ اُنھوں نے شعر کی اصلاح میں ظاہری عیوب کو دور کرنے کی کوشش کی ہے اور کسی لفظ کو بدل دینے یا مصرع میں تھوڑی سی تبدیلی نے شعر کو فصاحت سے قریب کر دیا ہے۔

داغ دبستانِ دہلی کا آخری نمائندہ تھا جس نے شاعری کو ایک نیا آب و رنگ عطا کیا۔ کسی بھی زندہ زبان کا یہ خاصہ ہے کہ ہر دور میں تغیرات اور تبدیلیوں کو قبول کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر آنے والا زمانہ اپنے گزشتہ زمانے کے مقابلہ میں خیالات کے اعتبار سے زیادہ مالا مال اور زبان کے اعتبار سے زیادہ صاف اور شستہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذوق کے مقابلہ میں داغ کی زبان زیادہ منجھی ہوئی اور فصاحت سے بھرپور ہے۔ سلاست اور فصاحت ان کا معیارِ نقد بنا۔ الفاظ کے استعمال میں تنوع پیدا ہوا۔ اُنھوں نے جو ضابطہ نقد و نظر بنایا اس پر خود بھی عامل رہے۔ اس دور میں داغ کی شاعری کو ممکن ہے کوئی متاع کا سر سے تعبیر کرے مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ زبان کو جو فصاحت اور کج کلاہی داغ نے عطا کی ہے وہ کسی اور نے اُردو زبان کو عطا نہیں کی۔ فراق کے الفاظ میں۔

”داغ کا تغزل سرا سرا سوخت سہی لیکن اس کی بے پناہ قوتِ اظہار

کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ مغلیہ خاندان کی تلوار کی فاتحانہ شان اور چکا چوند
 کر دینے والی چمک دمک جب زندگی اور جذبات کی تاریک پستیوں میں
 اپنے جلوے دکھاتی ہے تو وہ داغ کی شاعری بن جاتی ہے، یہ،
 یہی سبب ہے کہ تاریخ کے اتنے ادوار گزرتے کے بعد بھی آج زبان پر جو اثر داغ کا
 ہے وہ کسی دوسرے شاعر کا نظر نہیں آتا۔

دآغ اور مذاق سخن

نواب مرزا دآغ دہلوی اپنے عہد کے سب سے زیادہ معروف شاعر تھے۔ اُن کے کلام میں سادگی کے ساتھ ساتھ شوخی، روانی اور برجستگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس نقطہ نظر سے اگرچہ اُن کے کلام کو بہت کچھ دیکھا اور پرکھا جا چکا ہے لیکن اسے ابھی اور دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ دآغ کی شاعری تمام و کمال عشق و عاشقی کی شاعری ہے۔ ان کے بے شمار اشعار ایسے ہیں جو محبت کرنے والوں کے دلوں کو گرماتے ہیں اور جنہیں منچلے نوجوان خطوں میں لکھنے یا ملاقاتوں میں سنانے کے لیے پڑھ پڑھ کر یاد کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے اگر ہم دآغ کے کلام کی لسانی خوبیوں سے صرف نظر کر کے اُسے محض معنوی سطح پر دیکھیں اور اُس میں اپنی ذہنی آسودگی کا سامان تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگیں تو ہو سکتا ہے ہمیں مایوسی ہو۔ دآغ کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے چلبست بھی اسی مایوسی کا سامنا کرتے دکھائی دیتے ہیں :

” دآغ کی شاعری ان جذبات و خیالات کی تصویر ہے جن سے فطرت انسانی

زبان پر اُن کا غیر معمولی احسان ہے اُن کے کلام میں زبان کا چٹخارہ، سلاست، صفائی، سادگی، شستگی، سحر آفرینی، رنگینی، شوخی، چلبلاہٹ، تیزی و طراری، شیرینی اور گھلاوٹ بلا کی پائی جاتی ہے وہ عاشق مزاج، رند شاہد باز، بذلہ سنج، حاضر جواب، ظریف، طباع اور غیر معمولی ذہانت کے مالک ہیں، اُن کا لب و لہجہ نشا طیبہ، طبیعت میں شگفتگی، انداز میں تکیہ پن، طنز میں دلکشی، فکر میں بالیدگی، مزاج میں والہانہ پن، خیال میں رعنائی اور مضمون میں رنگینی بدرجہ اتم موجود ہے جو اُن کے کلام میں جگہ جگہ ظاہر ہوتی ہے اُن کے یہاں محاورات، روزمرہ، ضرب الامثال کی غیر معمولی کثرت زبان سے اُن کے دیوانہ وار عشق کا کھل کر اظہار کرتی ہے اُن کے الفاظ کی ترتیب و نشست کا انداز انگوٹھی میں نگینے کا پتہ دیتا ہے زبان کی لطافت، نزاکت، لوج، لچک اور روانی کے اعلیٰ نمونے جو اُن کے یہاں ملتے ہیں وہ کہیں اور نہیں۔ وہ لب و لہجے کے زبردیم، محاورات کی تہذیبی و ثقافتی اثر آفرینی اور زبان کی جادو نگاری کے فن پر اس قدر قدرت رکھتے ہیں کہ اس میدان میں اُن کا کوئی حریف نظر نہیں آتا، وہ اپنے فن شاعری کے سبب ایک مکمل ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے ذریعہ انھوں نے اردو کی تاریخی خدمت انجام دی ہے۔

داع ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اپنے والد نواب شمس الدین احمد خاں دانی فیروز پور بھکر کی موت کے بعد اُن کی والدہ نے ۱۸۳۴ء میں ولی عہد بہادر مرزا فخر دوسے دوسرا نکاح کر لیا اور اس طرح وہ ۱۳، ۱۴ برس کی عمر میں قلعہ معلے میں داخل ہوئے جہاں ۱۸۵۷ء تک اُن کا قیام رہا اور اس دوران اُن کو قلعے کے علمی و ادبی ماحول میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ۱۸۵۷ء کے بعد وہ دوبار رام پور سے وابستہ ہو گئے اور وہاں نواب کلب علی خاں کے دور تک مقیم رہے، ہر طرح کے اعزاز و احترام سے نوازے گئے، نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد وہ دہلی آ گئے۔ پھر احباب کے اصرار پر حیدر آباد گئے۔ پھر دہلی واپس ہوئے اور ملک کے دوسرے شہروں کی سیاحت کرتے رہے اور دوسری بار جب حیدر آباد گئے تو قسمت نے یادری کی اور نواب میر محبوب علی خاں دانی حیدر آباد کے استاد مقرر ہوئے اس طرح اعلیٰ جاہ و منصب و خطابات و انعامات سے

کا حیوانی حصہ مراد لیا جاتا ہے اردو شاعری عموماً عاشقانہ شاعری کہلاتی ہے اور ایسا کہنا ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ لیکن اردو شعرا نے عموماً حسن و عشق کی تصویریں اپنے جادو نگار قلم سے کھینچی ہیں۔ مگر جو اعلیٰ درجے کے اردو شاعر ہیں انھوں نے حسن کو محض بازاری حسن نہیں سمجھا اور عشق کو محض جذبہ حیوانی نہیں خیال کیا ہے برعکس اس کے داغ کا معشوق ہمیشہ بازاری معشوق ہے اور داغ کے نزدیک عشق نفس پرستی کا دوسرا نام ہے۔ اس صورت میں داغ کی شاعری کو عاشقانہ شاعری کہنا زیادہ نہیں ہے کیونکہ داغ حسن و عشق کے اعلیٰ مفہوم سے بے خبر تھے۔ داغ کی شاعری عیاں شانہ شاعری ہے۔“

لیکن داغ کو عیاش شاعر کا فتویٰ دے دینے کے بعد اسی مضمون میں چکبست نے آگے چل کر داغ کے بارے میں ایک بات یہ بھی کہہ دی ہے کہ ”داغ کا کلام عموماً شاعری کے عیبوں سے پاک ہے اور ان کا ضروریات شعر سے باخبر ہونا ثابت کرتا ہے۔ لہذا یہیں سے ہم اپنی بحث کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے۔“

اگر داغ ایک عاشق مزاج اور عیاش انسان تھے تو وہ ایک عیاش شاعر بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا سخن دری کے نقطہ نظر سے اس عیاش شاعر کی تھوولی میں کچھ اور بھی ہے۔ اگر ہم داغ کے ہاں اس کچھ اور کی تلاش کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان کی شاعری کے قلمرو سے باہر نکل کر ان کی نثری نگارشات کے ہنار خانے کی سیر کرنی پڑے گی۔ داغ کی باقاعدہ نثری تصانیف نہیں ہیں۔ انشاء داغ، اور زبان داغ کے نام سے داغ کے جو خطوط شائع ہوئے ہیں بے دے کر داغ کی نثر وہی ہے۔ البتہ ہم اپنے موجودہ مقصد کو حل کرنے کے لیے داغ کے ان فرمودات کو بھی ان کی نثر میں شامل کر سکتے ہیں جن کا ذکر تفصیل کے ساتھ ”بزم داغ“ نام کی کتاب میں ملتا ہے۔ ”بزم داغ“ مولانا حسن مارہروی اور مولانا افتخار عالم مارہروی

کا وہ روز ناچ رہا ہے جو داغ کے ساتھ ان کی قبرتوں اور صحبتوں کی یادگار ہے۔
 کسی بھی شاعر کی سخن فہمی پر ایمان لانے کے لیے اول تو اس کا کلام ہی کافی ہے
 لیکن اگر اس شاعر نے اپنی سخن فہمی کا ثبوت کلام کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی دیا
 ہے تو اس سے اس کی سخن فہمی کا اعتبار اور بڑھ جاتا ہے۔ داغ کی نثر اور ان کے فرمودات
 ہمارے لیے اس اعتبار سے اہم ہیں۔

مذاق سخن کی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ ایک اجتماعی سطح اور دوسری انفرادی سطح۔
 اجتماعی سطح تو وہ ہے جہاں مذاق سخن پورے معاشرے میں اس طرح رچ بس جاتا
 ہے کہ غیر ارادی اور بے ساختہ طور پر ان تمام لوگوں کی فکر کا ایک حصہ بن جاتا ہے جو
 اس مخصوص مذاق کی روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مذاق کی یہی وہ اجتماعی سطح ہے جہاں
 اردو کے معمولی سے معمولی بیان تک کے ان پڑھ غزل گو شاعر کے ہاں بھی لفظی رعایتیں، شعری
 تلمازے، ایہام کی چاشنی سب کچھ مل جاتا ہے۔ گفتگو کے بہت معمولی فقرہ میں بھی
 لوگ بے سوچے سمجھے بے دام غلام، کی ترکیب استعمال کر جاتے ہیں بغیر یہ جانے ہوئے
 کہ بے دام، میں معنی کی اکہری نہیں دوسری تہہ ہے۔ مذاق شاعروں کے ہاں بھی
 انفرادی مذاق کی سطح پر کبھی کبھی یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ شاعر نے کلام میں
 کوئی بات واقعی نکتہ رسی کے ساتھ پیدا کی ہے یا وہ شعری روایت کے تحت اپنے آپ
 پیدا ہو گئی۔ مثال کے طور پر ریاض خیر آبادی کا یہ مشہور شعر لیجیے۔

جام مے تو بہ شکن تو بہ مری جام شکن

سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

اس شعر کے آخر میں ٹوٹے ہوئے پیمانوں، کی ترکیب بیان کی خوبی کا بہترین مظاہرہ
 ہے یعنی ٹوٹے ہوئے پیمانے بادی النظر میں تو شراب کے ٹوٹے ہوئے جام ہیں لیکن
 اس کے ساتھ ہی یہ ٹوٹے ہوئے عہد بھی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پیمانوں کا لفظ
 یہاں جس قدر بر محل ہے کیا شاعر نے اس کے انتخاب میں شعوری طور پر اتنا ہی زور
 سخن فہمی بھی صرف کیا ہے اور اگر ایسا نہیں تو ہمیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں، کو انفرادی

مذاقِ سخن کے بجائے اجتماعی مذاقِ سخن کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ اس اعتبار سے داغ کی جو بھی نثر ہمارے سامنے ہے وہ مفید اور کارآمد ہے اس نثر سے داغ کی سخن فہمی کی وہ تمام جہتیں ہمارے سامنے آتی ہیں جن میں آدابِ مکتب، اصلاحیں، محاوروں اور زبان کا علم اور اس کے استعمال پر قدرت اور زبان و بیان کی دوسری باریکیاں شامل ہیں۔

آدابِ مکتب :

جس طرح سماجی زندگی کے کچھ آداب ہوتے ہیں اُسی طرح ادب کے روایتی مکاتب کے بھی کچھ آداب ہوا کرتے تھے۔ ان آداب سے واقف ہونا اور انہیں ملحوظ رکھنا انتہائی ضروری ہوا کرتا تھا۔ داغ کی عمر کے وہ بیس بائیس سال جن میں ذہن کی نشوونما اور تربیت ہوتی ہے لال قلعے میں گزر رہے تھے۔ وہ مغل دربار کے آداب اور روایتوں سے واقف تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے ہاں ڈسپلن کا شعور تھا۔ چنانچہ وہ ادبی معاملات میں بھی ڈسپلن کا پورا خیال رکھتے تھے۔

داغ حیدر آباد میں نظام کے دربار سے متوصل ہی نہیں تھے وہ نظام کے استاد بھی تھے۔ ریاضِ سخن، کے نام سے احسن مارہروی شاعری کا ایک گلدستہ نکالتے تھے جس میں ہر بار کوئی مصرعِ طرح دیا جاتا تھا۔ طرح میں داغ کے دوسرے شاگردوں کے ساتھ ساتھ نظام کی غزل بھی آتی تھی۔ داغ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ طرحی غزلوں میں توارد کی بنا پر کسی شاگرد کا شعر نظام کے شعر سے نہ لڑ جائے اگر ایسا ہوتا تھا تو وہ شاگرد کا شعر کوٹا دیا کرتے تھے۔

اس زمانے کے آدابِ مکتب میں دربار کے یہ آداب بھی شامل تھے کہ نظام حیدر آباد کی غزل جب ریاضِ سخن، میں چھپنے کے لیے جاتی تھی تو غزل کی کتابت کے بعد غزل کا کاغذ واپس نظام کے دربار میں طلب کیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ جب نظام کی غزل ریاضِ سخن،

کے دفتر میں پہنچی تو صورت یہ تھی کہ کاتب نے سہواً مطلعے کے دونوں مصرعوں میں ایک ہی قافیہ لکھ دیا تھا۔ داغ نے یہ ہدایت کی کہ کاغذ کو کھرچ کر قافیہ درست کرادیا جائے تاکہ جب کاغذ دربار میں واپس پہنچے تو کاتب پر عتاب نازل نہ ہو۔

داغ مصرعِ طرح تجویز کرنے کو بھی ایک نازک معاملہ سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ کوئی بھی مصرعِ طرح کرنے سے پہلے اس کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح دیکھ لینا چاہیے۔ یعنی یہ کہ وہ مصرع کس شاعر کا ہے اور کن شعرا کو اس طرح میں غزلیں کہنے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ بھی دیکھنا ضروری تھا کہ طرح کا مصرع ایسا نہ ہو جس میں کسی قسم کا مستقیم ہو۔ کیونکہ اس سے اس بات کا اندیشہ رہتا تھا کہ لوگ اُس پر حرف رکھیں گے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ریاض سخن میں احسن مارہروی نے داغ کا یہ مصرعِ طرح کر دیا۔ میں نے وہ رنج اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے۔" داغ نے اس مصرع کے طرح کیے جانے کو ناپسند کرتے ہوئے احسن مارہروی کو لکھا کہ میں نے یہ غزل فرمائش پر کہی تھی اس میں دجانتا، کا الف دبتا ہے جو خلاف فصاحت ہے۔ یہ مصرعِ طرح کے بارے میں داغ کا ایک رویہ یہ بھی تھا کہ وہ ایسے شاعر کے مصرعِ طرح پر غزل کہنا پسند نہیں کرتے تھے جو اُن کے کلام پر اعتراض کرتا ہو۔

حیدر آباد پہنچنے کے بعد جب داغ نظام حیدر آباد کے استاد ہوئے تو اُن کی شہرت کو چار چاند لگ گئے اور اُن کے شاگردوں کا حلقہ اتنا وسیع ہو گیا کہ ملک کے ہر حصے میں ان کے شاگرد موجود تھے۔ شاگردوں کی تعداد دو ڈھائی ہزار تک پہنچ چکی تھی چنانچہ شاگردوں کا ایک رجسٹر بنالیا گیا تھا جس میں تمام شاگردوں کے نام اور پتے نمبر وار درج ہوتے تھے اگر کسی شاگرد کا نام رجسٹر میں لکھا گیا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اُسے شرفِ تلمذ حاصل ہو گیا۔

داعغ کے کسی شاگرد نے اگر کبھی اپنی غزل بغیر اصلاح کے چھپوادی تو اس پر
داعغ نے اظہارِ ناراضگی کیا ہے کیوں کہ وہ اس بات کو مُسکَم آداب و روایت کے خلاف
سمجھتے تھے۔ ایسی صورت میں اگر شاگرد سے زبان کی کوئی غلطی ہو جائے تو اس میں
اُستاد کی بدنامی تھی۔ ایسی ہی کسی بے اصلاحی غزل میں اُن کے کسی شاگرد نے 'ایجاد'
اور 'ارشاد' کو مونث باندھ دیا تھا اور ایک اور شاگرد نے بُو کے قافیے میں ابرو کو مونث باندھا تھا۔
داعغ شاگردوں کے کلام پر اصلاح خود دیا کرتے تھے اُن کے کسی بھی شاگرد
کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ دوسرے شاگرد کے کلام پر اصلاح دے۔

کلام پر اصلاح دیتے ہوئے داعغ کبھی بھی پورا شعر یا مصرع نہیں دیا کرتے
تھے صرف ایک آدھ لفظ اِدھر اُدھر کرنا یا بنانا ہوتا تھا تو بنا دیتے تھے ورنہ پورا
مصرع یا شعر کاٹ دیا جاتا تھا۔

داعغ کی اصلاحیں:

داعغ اشعار پر اصلاح کس طرح دیا کرتے تھے اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔
احسن مارہروی کا شعر تھا

دیکھنے کے لیے آیا ہے زمانہ اس کو
اک تماشا ہے مسافر بھی سفر سے پہلے
داعغ نے صرف دو لفظوں کی جگہ بدل کر شعر کو یوں درست کیا
دیکھنے کے لیے آتا ہے زمانہ اس کو
اک تماشا ہے مسافر بھی سفر سے پہلے

احسن کا شعر تھا

نہیں اکھٹیں، نہیں ملتیں، نہیں کھلتیں آنکھیں
شرم ہے نشہ ہے یا نیند نہیں آتی ہے

داغ نے پہلے مصرعے کی ترتیب اس طرح بدل دی ہے
 نہیں کھلتیں، نہیں اُٹھتیں، نہیں ملتیں آنکھیں
 یعنی آنکھیں پہلے کھلیں گی پھر اُٹھیں گی پھر ملیں گی۔ لے
 مفتی ذوالفقار علی بلگرامی کا مطلع تھا ہے

بزمِ عدو میں کیا نہ ہوا اور کیا ہوا
 کہتا ہے صاف آپ کا سرمہ بہا ہوا
 داغ نے صرف شعر کے پہلے لفظ 'بزم' کو مرگ سے بدل دیا اور اب شعریں ہو گئے
 مرگِ عدو میں کیا نہ ہوا اور کیا ہوا
 کہتا ہے صاف آپ کا سرمہ بہا ہوا
 یعنی 'مرگ' سے رونے کا جواز بھی پیدا ہو گیا اور عدو بھی موت کے گھاٹ اتر گیا۔
 نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کا شعر تھا ہے

کیا جانیں آپ تیغ کی لذت جنابِ تحضر
 نازاں ہیں وہ تو اپنے ہی آپ حیات پر
 داغ نے مصرعِ ثانی کے دو لفظ بدل کر شعر اس طرح کر دیا ہے
 کیا جاتیں آپ تیغ کی لذت جنابِ تحضر
 مرتے ہیں وہ تو چشمہٴ آبِ حیات پر
 اس طرح ایک تو آبِ حیات کی مناسبت سے شعر میں مرتے ہیں کا لفظ آگیا اور دوسرے
 اپنے ہی سے جو سقم پیدا ہو رہا تھا وہ جاتا رہا۔

ایسے دوشاد گردوں کو بعض اشعار کے سلسلے میں جن کا پتا نہیں چلتا داغ نے
 یہ الفاظ نکھے تھے :

”بادیہ پیمانی کی دی، اگر قتی ہے میں فارسی کے الفاظ میں گرتا ہوا حرفت
نہیں رکھتا ہوں۔ چال و انداز، کا عطف جائز نہیں ہے وہ ہندی ہے یہ
فارسی ہے۔ سہ الہی نہ اس کے سوا چاہتا ہوں، لفظ، نہ کی جگہ نہیں چاہیے
”نہ، خلاف محاورہ ہے یہ۔“

داغ کی اصلاحوں کے سلسلے میں چلتے چلتے ایک دلچسپ اصلاح کا بھی قصہ سن لیجئے۔
مولانا احسن مارہروی نے اپنا یہ شعر بغرض اصلاح پڑھا ہے
کسی دن جا پڑے تھے بے خودی میں اُن کے سینے پر
بس اتنی سی خطا پر ہاتھ کچلے میرے پتھر سے
صائب جان نام کی ایک طوائف بھی اس صحبت میں موجود تھی شعر سن کر بولی اُسن صائب
بے خودی میں بھی دونوں ہاتھوں سے کام لیتے ہیں۔ داغ اس پر مسکرائے اور بولے
میاں احسن تمہارے شعر پر صائب جان نے اصلاح دے دی۔ یہ کہتے ہوئے داغ
نے اس شعر کو برجستہ اس طرح درست کیا ہے

کسی دن جا پڑا تھا بے خودی میں اُن کے سینے پر
بس اتنی سی خطا پر ہاتھ کچلا میرا پتھر سے

داغ کے استاد ذوق نے یہ نصیحت کی تھی کہ تمہارے دیوان کے جس نسخے پر
میں نے اصلاحیں دی ہیں اسے سنبھال کر رکھنا اور اسے وقتاً فوقتاً دیکھتے رہنا ایک
زمانہ گزرنے کے بعد مشاق ہو جاؤ گے تو ان کی اصلاحوں کو دیکھنے میں بڑا لطف آیا کرے گا
چنانچہ داغ ایسا ہی کرتے تھے اور کہتے تھے واقعی اس میں بڑا لطف آتا ہے۔
داغ کی اصلاحوں کی روشنی میں داغ کے اس قطعے کے چند اشعار یہاں
دیہر ادینا بے جان ہو گا جو انھوں نے اپنے شاگردوں کے لیے بطور ہدایت نامہ
رقم کیا تھا:

عربی فارسی الفاظ جو اردو میں کہیں
 حرفِ علت کا براُن میں ہے گر نادبنا
 الفِ وصل اگر آئے تو کچھ عیب نہیں
 لیکن الفاظ میں اردو کے یہ گرنا ہے روا
 ہے اضافت بھی ضروری مگر ایسی تو نہ ہو
 ایک مصرعے میں جو ہو چار جگہ بلکہ سوا
 عطف کا بھی ہے یہی حال یہی صورت ہے
 وہ بھی آئے متواتر تو نہایت ہے بُرا
 جو نہ مرغوب طبیعت ہو بُری ہے وہ ردیف
 شعر بے لطف ہے گر قافیہ ہو بے ڈھنگا
 ایک مصرعے میں ہو تم دوسرے مصرعے میں تو
 یہ شتر گریہ ہوا میں نے اسے ترک کیا
 مختصر یہ ہے کہ ہوتی ہے طبیعت استاد
 دین اللہ کی ہے جس کو یہ نعمت ہو عطا
 گرچہ دنیا میں ہوئے اور ہیں لاکھوں شاعر
 کسبِ فن سے نہیں ہوتی ہے یہ خوبی پیدا
 داغ کے غزلیہ اشعار کی تعداد لگ بھگ سولہ ہزار ہے ان میں سے منتخب داغ
 کے نام سے احسن مار ہر دی کے منتخب کیے ہوئے چھ ہزار کے قریب شعرا ایسے ہیں جن
 میں داغ نے عطف و اضافت کا استعمال نہیں کیا ہے۔

لنکاتِ سخن

سے ”زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔“ ذوق کے اس مصرعے کو ضرب المثل کی سی

حیثیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ حکایت سن لیجئے: کہا جاتا ہے کہ دہلی کے چاؤڑی بازار کی ایک طوائف دن بھر اپنے درنیچے میں بیٹھی بازار کا نظارہ کرتی تھی۔ اس طوائف نے ایک لونڈی رکھ چھوڑی تھی جس کا کام یہ تھا کہ جب کبھی بھی بازار سے کوئی جنازہ گزرتا تو فوراً لونڈی کو حکم دیتی کہ جا دیکھ کر آ کہ مردہ جنت میں گیا یا دوزخ میں۔ لونڈی بھاگی ہوئی جاتی اور کچھ دیر بعد واپس آ کر مردے کے دوزخ یا جنت میں جانے کی خبر دیتی۔ ایک روز جب کہ ایک رئیس بھی طوائف کے پاس بیٹھے تھے کوٹھے کے نیچے سے جنازہ گزرا۔ حسب دستور لونڈی کو حکم ہوا کہ مردے کی عاقبت کی خبر لائے۔ لونڈی دوڑی ہوئی گئی اور واپس آ کر جو کیفیت کھتی بیان کر دی۔ رئیس نے طوائف سے دریافت کیا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے مردے پر جنت یا دوزخ کا حکم کون لگاتا ہے۔ طوائف نے مسکرا کر جواب دیا۔ جنازے کے ساتھ چلتے والے لوگ، جیسی وہ مرنے والے کے بارے میں باتیں کرتے ہیں ویسی ہی اس کی عاقبت۔ آئیے اب اس حکایت کی روشنی میں اسیر کے اس قول پر نظر ڈالی جائے جہاں وہ کہتے ہیں ”وہ کلام پسندیدہ ہے جو مشاعرے سے باہر جائے“۔ احسن مارہروی نے داغ کے رام پور کے زمانے کے واقعات نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ منشی مظفر علی اسیر کا یہ دستور تھا کہ مجلس مشاعرہ برخواست ہونے سے پہلے خود باہر آڑ میں کھڑے ہو جاتے تھے اور جانے والوں کو دیکھا کرتے کہ ان کی زبان پر کس کا شعر ہے اور اسیر کا کہنا تھا کہ لوگوں کی زبان پر داغ کے شعر ہوتے تھے بلکہ

داغ شعر میں محاورات کے استعمال کو پسند کرتے تھے لیکن وہ ہمیشہ محاورے کے صحیح استعمال پر زور دیتے تھے وہ اپنے شاگردوں سے کہتے تھے کہ شعر کے لیے محاورہ آئے محاورے کے لیے شعر میں سقم نہ پیدا کیا جائے۔ وہ اس بات پر بار بار زور دیتے تھے کہ محاورے میں کسی قسم کا تصرف جائز نہیں اگر محاورہ بحر میں

بجائے نظم ہو سکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ محاورہ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دآغ اپنی جو غزلیں چھپنے کے لیے بھیجتے تھے ان کے بارے میں انھیں غزل بھیج چکنے کے بعد بھی یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی محاورہ خلاف نہ بندھا ہو۔ چنانچہ احسن مارہروی جیسے شاگردوں کو یہ ہدایت تھی کہ اگر کوئی شعر میرے مسلک کے خلاف ہو تو اسے خود نکال دو ورنہ محاورات کے معاملے میں دآغ اپنے سے زیادہ اپنی بیوی پر بھروسہ کرتے تھے۔ کسی محاورے کے بارے میں انھیں کوئی شبہ ہوتا تھا تو بیوی سے رجوع کرتے تھے۔ یہ زبان دانی کا بہت باریک نکتہ ہے۔ زبان کے رد و مزہ اور محاورے کے معاملے میں گھر کی چہار دیواری میں رہنے والی بہو بیٹیوں کی زبان جس قدر مستند ہو سکتی ہے اتنی مجلسوں اور بازاروں میں اٹھ بیٹھنے والے شہر شہر پھرنے والے اور بھانت بھانت کے لوگوں سے ملنے والے اُن مردوں کی نہیں ہو سکتی۔ جو تہذیبی اور لسانی اختلاط کی فضاؤں میں سانس لیتے ہیں اور زبان کے بگڑنے کے امکانات سے ہر وقت دوچار رہتے ہیں۔ اس بحث کی روشنی میں دآغ کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

دلبر سے جدا ہونا یا دل کو جدا کرنا

اس سوچ میں بیٹھا ہوں آخر مجھے کیا کرنا

لکھنؤ والوں نے اس شعر کی زبان پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا کہ دآغ مجھے کیا کرنا، حیدرآباد کی اردو ہے دآغ حیدرآباد کیا گئے اردو دہلی ہی میں چھوڑ گئے۔ سہہ چکبست کا کہنا ہے کہ دآغ نے ایسے محاورے بھی نظم کیے ہیں جن کا اصل مضمون غنٹ رבוד ہو گیا ہے انھوں نے اس سلسلے میں دآغ کے دو شعروں کا حوالہ دیا ہے۔

دآغ کا شعر ہے۔

آنسو نہ پیے جائیں گے اے ناصح ناداں

ہیرے کی کئی جان کے کھائی نہیں جاتی

۱۰۶/ ص ۱۰۶

۱۲۳/ ص ۱۲۳

۱۲۴/ ص ۱۲۴

۱۱۴/ ص ۱۱۴